ابنِ انشا کا سفرنامہ

چلتے ہو تو
چین کو چلیے



زیدی کے کارٹونوں کے ساتھ

چلتے ہو تو چین کو چلیے

زیدی کے کارٹونوں کے ساتھ

ابنِ انشا

جناب ابن انشا صاحب!

آپ سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کے چینی نغموں کا ترجمہ کر کے پاک چین دوستی کے لیے بہت اچھا کام کیا ہے۔ امید ہے کہ آپ واپس جانے کے بعد چین کے متعلق کچھ لکھیں گے اور پاک چین دوستی کو اور استوار کریں۔

پاک چین دوستی زندہ باد!

شان یون

۲۵ اپریل

پیکنگ یونیورسٹی

شعبی زبانان شرقیہ

فہرست

دیباچہ



ہم کیا اور ہمارا جانا کیا۔ جہاز میں بیٹھے اور زمین کی طنابیں کھینچ لیں۔ اندرون چین بھی اڑن کھٹولے اور دھویں کی گاڑی سے واسطہ رہا۔ یہ بھی کوئی سیاحت ہے، نہ سر میں گرد نہ پاؤں میں آبلہ۔ سیاحت کا منصب تو مارکو پولو کا تھا، ابنِ بطوطہ کا تھا۔ صاحبو۔ ان دنوں ایک شخص اُٹھتی جوانی میں سیر و سفر پر نکلتا تھا تو واپسی پر ’اگر واپسی ہوتی

تھی‘تو اس کے پوتے اس کا استقبال کرتے تھے۔ بعضوں کے تو پہچاننے والے بھی نہ ملتے تھے۔ کم از کم مارکو پولو کے ساتھ یہی گزری۔ اور جب اس نے یورپ کے عہدِ تاریک کے باسیوں کو چین کی چکاچوند کی کہانیاں سنائیں تو لوگوں نے اسے دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے کا خطاب دیا۔

طبعِ سوم کے موقع پر

یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے، اور روزنامہ جنگ میں ان مضامین کی قسط وار اشاعت کو بھی شمار کیا جائے تو طبع چہارم کہیے۔ ہمارے ملک میں کتابوں کی مانگ کا جو حال ہے اسے دیکھتے ہوئے اس کتاب کی یہ پذیرائی معمولی بات نہیں۔ لیکن یہ ساری خوبی موضوع کی ہے۔ لوگ اس عظیم اور نادر روزگار ملک کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کو بے تاب ہیں، اس کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے نہیں تو کتاب کے ذریعے سہی۔ محض اس لیے نہیں کہ یہ ہمارا دوست یا ہمسایہ ہے بلکہ اس لیے کہ پوری دنیا کے لیے منارۂ نور ہے اور آلائشوں سے پاک معاشرے کے لیے دلیلِ راہ۔ امریکی ہفت روزہ 'نیوز ویک' صدر نکسن کی چین یاترا کے متعلق سے ان

امریکی اخبار نویسوں کا ذکر کرتا ہے جو حال ہی میں چین سے لوٹ کر آئے ہیں؟

"یہ لوگ جو کچھ بتاتے ہیں وہ ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔ ناممکن نظر آتا ہے۔ بھلا روئے زمین پر کوئی ایسا ملک بھی ہو سکتا ہے جس میں جرائم نہ ہوں، جنسی امراض نہ ہوں، گندی بستیاں اور جھگیاں نہ ہوں، فضا اور پانی مسموم نہ ہو، عادی شراب خوار اور نشے باز نہ ہوں، حتیٰ کہ چھوٹے بڑے افسر اور ماتحت کا امتیاز بھی نہ ہو۔"

بیشک جب تک اپنی آنکھوں نہ دیکھیے، یقین نہیں آتا کہ کوئی ملک ترقّی بھی کر رہا ہو اور ان آلائشوں سے محفوظ ہو جن کا اوپر ذکر آیا ہے۔ جہاں چور نہ ہوں اور لوگوں کو گھروں میں تالے نہ لگانے پڑتے ہوں۔ گرانی نہ ہو، ذخیرہ اندوزی نہ ہو، بیروزگاری نہ ہو، فحاشی نہ ہو ٹھاہ ٹھاہ فلمیں نہ ہوں اور ملاوٹ نہ ہو، ٹریفک کے حادثے نہ ہوں اور جھوٹی اشتہار بازی نہ ہو، ہمہ گیر تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور کا یہ حال ہے کہ "نیوز ویک" ہی کے الفاظ میں:

"آپ کسی چینی دہقان سے کوئی سیاسی سوال کیجئے تو وہ معقول جواب دے گا۔ ایشیا کے کسی دوسرے ملک کے دہقان کی طرح بُدھوؤں کی طرح منہ نہیں دیکھتا رہے گا۔"

صحت کا یہ انتظام ہے کہ ڈاکٹر لوگ شاندار دفتروں میں نہیں بیٹھتے اور بیرون ملک نوکریوں کی تلاش نہیں کرتے، بلکہ لالٹین لیے، دواؤں کے بکس اُٹھائے قریہ قریہ گھومتے رہتے ہیں۔ یہ وہی چینی لوگ تو ہیں کہ سر پر چوٹیاں رکھے افیم کے نشے میں غین رہتے تھے اور جن کی اخلاقیات کا ناک نقشہ اب بھی ہانگ کانگ و سنگاپور کی گلیوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ انقلاب۔۔۔ گراں خواب چینیوں کا اس طور سنبھلنا کہ چمتکار معلوم ہوتا ہے، کوئی راتوں رات کی بات نہیں، اس کے پیچھے جدوجہد، قربانیوں اور بے لوث قیادت کی ایک لمبی داستان ہے۔

پاکستانی ادیبوں کا وفد جس کی سیاحت کی داستان یہ سفرنامہ ہے اپریل ۱۹۶۶ء میں چین گیا تھا۔ آج چین کا جادو دنیا کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ چین اقوامِ متحدہ کا ممبر بن چکا ہے۔ دنیا کی سے بڑی طاقت کا سربراہ اس کے دَر پر خود جا کر دستک دیتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں سیاست اور فکر کی نہج میں جو انقلاب آیا ہے، اس میں چین کی مثال کو بہت کچھ دخل ہے۔

ع جس وقت دیکھا نہ تھا اب ادھر دیکھا تو ہے

اس ایڈیشن میں کچھ نئی تصویریں شامل ہیں، ہمارے محترم پیر حسام الدّین راشدی کا

عطیہ ہیں کہ اس سفر میں ہمارے رفیق تھے اور جن کی باغ و بہار طبیعت کے جوہر ہم پر اس سفر میں کھلے۔

ابن انشا

۱۸ فروری ۱۹۷۲ء

کیا قافلہ جاتا ہے

ہم نے بہت کوشش کی کہ ہمارے چین جانے کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، لیکن تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ۔ یہ بات نہیں کہ ہم چھپ چھپ کر بھیس بدل کر بلا پاسپورٹ چین جارہے تھے، یا مغربی دنیا سے اس امر کو چھپانا مقصود تھا، بلکہ محض دوستوں ادر ہمسایوں سے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لیے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم جب ایران گئے ہیں تو ہماری جیب میں دوستوں، رشتہ داروں اور ہمسایوں ماں جایوں کی فرمائشوں کی ایک لمبی لِسٹ تھی۔ منجملہ

1۔ گیس پر چلنے والا چولھا جس پر روٹی بھی پک سکے

2۔ پانچ سیر کشمش، اچھی سی دیکھ کر

3۔ فلپس کا بڑا ٹرانسسٹر ریڈیو

4۔ اصفہانی تمباکو کا ایک پُڑا

5۔ جاپانی ڈنر سِیٹ

6۔ ایک چھوٹا سا معمولی ایرانی قالین

7۔ شیراز کا خُوشبودار تیل، ایک کُپّی

8۔ کنگھیاں اور پراندے (چُٹلے)

9۔ سوکھی ہوئی مچھلی کے چند ڈبے

10۔ سوئیٹر بننے کی سلائیاں، آٹھ نمبر کی

ہم ان فرمائشوں میں سے صرف نمبر ۸ اور ۱۰ کی تعمیل کر پائے تھے۔ یعنی فقط چند کنگھیاں، چند پراندے اور آٹھ نمبر کی سلائیاں سویٹر بُننے کی لا سکے۔ باقی پندرہ فرمائش کرنے والوں سے ہمارے تعلقات کی پرانی خوشگواری اور خلوص کبھی بحال نہ ہو سکا۔

اس رازداری کے باوجود ہمارے ایک دوست نے ہماری ڈائری میں لکھوا ہی دیا کہ بھابھی کے لیے دو سوٹ بروکیڈ کے، ایک پریشر ککر اور ایک سلائی مشین لے کر آنا۔ ایک بزرگ ہمسائے میں سے تشریف لائے اور کہا کہ آپ کو معلوم ہے میں یہاں کی کوئی چیز استعمال نہیں کرتا۔ میرے گھر میں سب چیزیں ولایت کی ہیں۔ میرے لیے مسالہ پیسنے کی بجلی کی مشین ضرور لانا۔ یہاں نہیں ملتی، چین میں مل جائے گی۔ ایک دوست کو معلوم تھا کہ چینی جوتا اچھا بناتے ہیں۔ وہ اپنے پاؤں کا ناپ ہمیں دے گئے کہ بس دو جوتے لیتے آنا۔ قیمت یہاں آنے پر نذر کر دوں گا بشرطیکہ میرے ناپ کے نکلے۔ ایک صاحب نے کہا پیکنگ کے تالابوں میں رنگا رنگ کی مچھلیاں ہوتی ہیں۔ ایک مرتبان میرے لیے بھر لائیو۔ ایک دوست ذرا روشن خیال قسم کے تھے۔ انہوں نے فقط اتنی فرمائش پر اکتفا کیا کہ کامریڈ ماؤزے تنگ سے میرا اسلام کہنا اور بتا دینا کہ میں ان کے سیاسی بیانات سے پوری طرح متفق ہوں۔ کچھ صاحبوں نے جاتے ہوئے تحفے بھی ساتھ کئے جن میں ایک سیٹ چو این لائی کے لیے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی تصانیف کا بھی تھا۔ لیکن زیادہ تر دوستوں نے خود اپنی تخلیقات سے نوازا۔ ہمارے دوست دیوانہ بھاگ پوری نے اپنا پھڑکتی ہوئی دِلگداز غزلوں کا دیوان اور راتوں کی نیند حرام کرنے والا اردو ناول دیتے ہوئے

تاکید کی کہ ان کو ذاتی طور پر ماؤزے تنگ کو پہنچانا۔ کسی اور کے ہاتھ مت بھیجنا۔ آج کل لوگوں کا اعتبار نہیں۔



جہاز صبح چھ بجے جانا تھا لیکن کسی نے کہا کہ چار بجے ہوائی اڈّے پر پہنچنا ضروری ہے۔ مطلب اس کا یہ ہوا کہ ساڑھے تین بجے سے پہلے گھر سے کوچ کرو اور ڈھائی بجے بسترِ استراحت سے اُٹھ کھڑے ہو۔ ہم نے پُوچھا کوئی ایسا جہاز نہیں کہ ہم اپنے وقت پر علی الصبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے اُٹھیں اور ناشتہ کھاتے پان گھماتے چھڑی گھماتے دس گیارہ بجے ہوائی اڈے پر پہنچ جائیں۔ لیکن پی آئی اے کے باکمال لوگوں نے کہا کہ جی نہیں۔ ہماری لاجواب پرواز ٹھیک چھ بجے روانہ ہو جائے گی۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ نہ جائیں۔ چین تو کبھی بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ آج رات کی

نیند ناحق خراب ہو گی۔ لیکن کچھ لوگ جن کو ہمارا پاکستان میں مسلسل زیادہ دن قیام جانے کیوں کھلتا ہے، کہنے لگے "میاں جاؤ، ہچر مچر کیوں کرتے ہو۔" انہی میں سے کسی نے ہمارے بازو پر امام ضامن بھی باندھ دیا۔ یعنی ہمارے نہ جانے کی راہ بالکل ہی مسدود کر دی۔

ہم صبح کیسے اٹھے یا اٹھائے گئے، اس کی داستان کا یہاں موقع نہیں لیکن ٹھیک چار بجے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ انتظار مخدومی پیر حسام الدّین راشدی اور پروفیسر وقار عظیم کا تھا۔ چین جانے والے ادیبوں کے وفد میں ہم تین کو کراچی سے روانہ ہونا تھا۔ تین آدمی ڈھاکے سے اس آبِ جو میں ملنے تھے۔ پرنسپل ابراہیم خاں، کوی جسیم الدّین اور ڈاکٹر انعام الحق لاہور سے، اعجاز بٹالوی اور ڈاکٹر وحید قریشی بھی ڈھاکے پہنچ چکے تھے۔ اور یوں یہ سارسوں کا قافلہ ڈھاکے میں مکمل ہو کر آگے چلنا تھا۔

جب ہم نے کھڑے کھڑے ایک ٹانگ کا بوجھ دوسری پر اور دوسری کا پہلی پر منتقل کرتے ہوئے ایک گھنٹہ گزار دیا تو پیر حسام الدّین راشدی تشریف لائے۔ ان کے جلو میں ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی بھی تھے جو پاکستان میں ترکی ٹوپی پہنے والے غالباً آخری مسلمان رہ گئے ہیں۔ دیکھا کہ بڑے پیر صاحب مخدومنا علی محمد راشدی بھی انہیں

بِدا کرنے آئے ہیں۔ ایک دو چینی اور افریقیوں کی ایک ٹولی بھی اسی جہاز سے جا رہی تھی اور ان میں ایک صاحب افریقہ کے کسی ملک کے، بڑی مشکل میں گرفتار تھے۔ انہیں انگریزی نہ آتی تھی اور پی آئی اے کے آدمی کو فرنچ میں دخل نہ تھا۔ آخر ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی کی ۱۹۳۳ء کی فرنچ سے مسئلہ حل ہوا۔ وہ اس کی انگریزی اُسے سمجھاتے، اس کی فرنچ کا اس کے لیے ترجمہ کرتے۔ کون کیا سمجھا یہ ہمیں معلوم نہیں۔ اتنا دیکھ کر دونوں چپ ہو گئے۔ اب ہمیں انتظار فقط پروفیسر وقار عظیم کا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے تک ان کی راہ دیکھی۔ پھر پی آئی اے والوں نے کہا کہ صاحبو جلدی چلو ورنہ تم بھی رہ جاؤ گے۔ جہاز چلنے کو ہے۔ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

وقار عظیم صاحب کا قصّہ بعد میں معلوم ہوا۔ ٹکٹ پر ٹریول ایجنٹ نے بجائے چھ کے ساڑھے چھ بجے کا وقت ڈال دیا تھا۔ اور وقار صاحب لدے پھندے عزیزوں کے جلو میں چھ بجے ہوائی اڈے پر پہنچے تو ہمارا جہاز پرِ پرواز کھول چکا تھا۔ وقار صاحب کو تین دن کراچی میں چین کی اگلی پرواز کا انتظار کرنا پڑا۔

ڈھاکہ میں جہاز گھنٹہ بھر ٹھہرنا ہے۔ ہمارے باقی رفیق یہاں ہم سے آن ملے۔ پرنسپل ابراہیم خاں وہی ازلی ابدی مہربان مسکراہٹ لیے، کوی جسیم الدّین اسی

طرح کنگھے سے بے نیاز زلفیں لہراتے، ڈاکٹر انعام الحق بنے ٹھنے، اعجاز بٹالوی بھی اور ڈاکٹر وحید قریشی بھی۔ ڈھاکہ سے اس جہاز کو پرواز کئے بس اتنی ہی دیر لگی ہو گی جتنی کراچی سے ڈھاکہ پہنچنے میں کہ ائیر ہوسٹس نے اعلان کیا ”صاحبان اپنے حفاظتی بند باندھ لیجئے اور سگریٹ بجھا دیجئے۔ چند لمحے میں آپ کینٹن کے ہوائی اڈے پر اتریں گے۔“

یہ ائیر ہوسٹس دِکھنے میں چینی لگتی تھیں لیکن بولتی انگریزی کے علاوہ اردو بھی تھیں۔ آخر ہمّت کر کے ہمارے ایک ساتھی نے ان کا اتا پتہ پوچھ ہی لیا۔ وہ کراچی کے رہنے والے چینیوں میں سے تھیں۔ یعنی پاکستانی چینی۔ ڈھاکہ سے چین جہاز جاتا ہے تو اس میں پورے مسافر شائد ہی کبھی ہوتے ہیں۔ بہت سی نشستیں خالی جاتی ہیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ والی نشست خالی تھی۔ اس پر انہوں نے اپنی ٹوپی اتار کر رکھ دی۔ ہم نے ان سے کہا کہ جناب اسے اٹھالیجئے ورنہ اس نشست کا کرایہ بھی وہ آپ سے چارج کر لیں گے۔ ہمارے کہنے کو تو انہیں اعتبار نہ آیا لیکن جب اعجاز بٹالوی نے اور راشدی صاحب نے بھی ہماری تائید کی تو انہیں یقین آ گیا اور بقیہ سفر میں وہ پی آئی اے والوں کی غیر معقولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی ٹوپی اپنے سر پر رکھے رہے۔

اور یوں جب ہماری گھڑی میں چھ، پیر صاحب کی گھڑی میں تین اور اعجاز کی گھڑی میں چار بج رہے تھے، ہم نے کینٹن کی پہلی جھلک دیکھی۔ پیر صاحب نے اپنی گھڑی میں کراچی کا ٹائم رہنے دیا تھا اور اعجاز نے ڈھاکہ کا، ہماری گھڑی کے چھ بجے کینٹن کا ٹائم تھا۔ چین کا ٹائم مغربی پاکستان کے ٹائم سے تین گھنٹے آگے ہے۔ اسی لیے تو ابھی ناشتہ پیٹ میں موجود تھا کہ لنچ کا ٹائم ہو گیا اور اس کے فوراً بعد سہ پہر کی چائے آ گئی اور جلد ہی شنگھائی پہنچتے ہی رات کا کھانا کھانا پڑ گیا۔ بے شک اس وقت شنگھائی میں آٹھ بجے تھے لیکن ہمارے معدے کو یہ باریکیاں کیا معلوم۔ کراچی میں تو ابھی پانچ بجے شام ہی کا عمل تھا۔ ایک دو روز تو ہم یونہی وقتوں کے فرق کے مخمصے میں گرفتار رہے۔ ایک بجے لنچ پر بیٹھتے اور یاد آتا کہ ابھی تو کراچی کے دس بجے ہیں، تو بھوک آدھی رہ جاتی اور صبح آٹھ بجے اُٹھتے اور سوچتے کہ کراچی میں ابھی پانچ کا عمل ہے اور لوگ خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوں گے تو بے اختیار وطنِ عزیز پر رشک آتا۔ لیکن چند دن میں انہی میں شیر و شکر ہو گئے بلکہ یوں کہئے کہ چینی ہو گئے۔ کینٹن۔۔۔ قدیم تاریخ کا امین اور انقلابی تحریکوں کا گہوارہ ہمارے سامنے حدِّ نظر تک پھیلا تھا۔ یہیں مغربیوں کے قدم پہلے پہل آئے۔ یہیں چین کے ایک با ہمّت محبِ وطن عہدے دار نے ۱۸۳۹ء میں افیم کی وہ بیس ہزار پیٹیاں برسرِ عام نذرِ

آتش کر دی جو ایسٹ انڈیا کمپٹی کے تاجر چینیوں کو افیمی بنانے کے لیے زبردستی لانے پر مصر تھے اور جس سے مشہور جنگِ افیم کا آغاز ہوا جس میں چین کی شکست کے بعد انگریزوں امریکیوں اور دوسرے مغربی ملکوں کے قدم چین میں جم گئے اور انہیں ملک کو لوٹنے کھسوٹنے اور من مانی کرنے کا موقع ملا۔ یہیں ۱۹۲۷ء میں چیانگ کائی شیک نے ہزاروں انقلابیوں کو ایک دن میں تہہ تیغ کر دیا اور کینٹن کی سڑکیں مدّتوں خونِ شہیداں سے رنگیں رہیں۔ اسی شہر میں عہدِ رسالت کے ایک غازی کے نقوشِ پا بھی ثبت ہیں یعنی رسول اللہ کے ایک صحابی ابی وقاص کا روضۂ مطہّر ہے جنہوں نے مشرقِ بعید کے اس دیارِ دور میں اسلام کا پودا کاشت کیا لیکن آج اس شہر پر ہماری فقط نظرِ خوش گزرے تھی۔ یہاں ہمیں کچھ دن بعد آنا اور چند دن ٹھہرنا اور زیارتیں کرنا تھا۔ اس وقت تو فقط ہوائی اڈّے پر گھنٹے بھر کو قیام تھا لیکن اسی ایک گھنٹے میں چشمِ شوق نے وہ نظارہ یہاں دیکھا کہ کبھی نہ بھولے گا۔ یہی ہمارے سفر کا دیباچہ اور نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

حاتم طائی کے نقش قدم پر

کینٹن کا موسم اس روز طرفہ خوشگوار اور فرح ناک تھا۔ بادل چھائے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مکان درخت پودے سبھی سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم ڈھاکے میں ہیں۔ اگر پیکنگ چین کا راولپنڈی اور شنگھائی چین کا لاہور ہے تو کینٹن کو چین کا ڈھاکہ کہئے۔ اس سے پہلے ایک شہر اور دیکھا تھا کہ ڈھاکے کو چھپاؤ اسے نکالو۔ نہ صرف سڑکیں، مکان، پرند، چرند، پودے، درخت، پھل، پھول عین مین ڈھاکے کی تصویر تھے بلکہ لوگوں کو دیکھ کر یہ گمان اور مضبوط ہوتا تھا۔ وہ شہر تھا کولمبو۔ کینٹن میں یہ بات اس حد تک نہ تھی لیکن ایک گونہ گو مناسبت تھی ضرور۔ دونوں سے مشرقِ بعیدیت صاف جھلکتی تھی جب کہ لاہور اور کراچی کی آب و

ہوائی اور جغرافیائی رشتہ مشرقِ وسطی سے ہے۔

کینٹن میں ہماری آمد کی کسی کو اِطّلاع نہ تھی کیونکہ ہماری منزل تو پیکنگ تھی لہٰذا آزادانہ گھومتے پھرے۔ دیکھا کہ ہوائی اڈّے کے میدان میں سینکڑوں بچیاں رنگا رنگ پوشاکیں پہنے بیر بہوٹیاں بنی ہاتھوں میں گجرے لیے پریڈ یا کسی پریڈ کی ریہرسل کر رہی ہیں۔ ہوائی اڈّے کے صدر دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا تو اور ایسی ہی کئی ٹولیاں نظر آئیں اور پھر ان ٹولیوں میں اضافہ ہو گیا۔ اب ہم سمجھ گئے کہ کوئی بڑا آدمی آنے والا یا جانے والا ہے۔ ایک دو آدمیوں سے پوچھا تو پتہ چلا کوئی وفد اسی جہاز سے روانہ ہو گا۔ اتنے میں ہوائی اڈے کے ایک اور بر آمدے میں ایک سکھ کھڑا نظر آیا۔ سکھ اور چین میں! ہم نے قریب جا کر دیکھا کہ اپنے سائیں خمیسو خاں الغوزے والے تھے۔ بڑے تپاک سے سلام علیک ہوئی اور یہ بھید کھلا کہ پاکستان کا ثقافتی وفد ہے۔ ابھی وداعی رسوم سے فارغ ہو کر انتظار گاہ سے بر آمد ہو گا۔

اس رند میں ہمارے کئی شناسا اور دوست تھے۔ بعض آرٹسٹوں سے بھی دُعا سلام تھی۔ نذیر بیگم نظر آئیں کہ چین کی ٹھنڈی آب و ہوا نے ان کو بیر بہوٹی بنا رکھا تھا۔ فردوسی بیگم کو بھی پہچانا۔ پاکستان کونسل لاہور کی ڈائریکٹر فرخ نگار عزیز سے بھی

یاد اللہ تھی ۔ انہوں نے ہائیں کہہ کر اعجاز کو آگیا۔ وفد کے لیڈر ظل الرحمٰن کہ ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر ہیں، ہمارے پرانے دوست ہیں ان سے مصافحے اور معانقے کی منازل طے ہوئی تو بولے، تم کہاں؟



ہم نے کہا۔ میاں جی! یہ دنیا کارواں سرا ہے۔ کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے۔ جس کام سے تم آئے تھے اسی سے ہم آئے ہیں۔ وہ ہے اس ہمسایہ قدیم سے کلچرل تعلقات کی استواری اتنا البتہ ہے کہ تم نے جس زبان میں بات کی ۔ رقص اور

موسیقی، وہ ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ ہم لکھنے لکھانے والے ترجمانوں کے محتاج ہوں گے۔ لیکن خیر، میاں آزاد دیکھیں گے۔

اب دونوں وفدیوں کے لوگ مل جل گئے۔ آنے والوں نے جانے والوں سے پوچھا کہ چین کیسا پایا؟ کیسے میں اس دیار کے لوگ؟ جس سے خطاب کرو لفظوں کی تلاش میں کھویا جاتا ہے۔ خمیسو خاں نے کہا کہ سائیں ہم نے تو ایسے آدمی زندگی میں کبھی نہ دیکھے۔ ایک اور آرٹسٹ بولے ایسے دوست اور مہمان نواز نہ دیکھے نہ سنے۔ جو محبت ان لوگوں نے ہم پر نچھاور کی ہے بیان سے باہر ہے۔ فرخ عزیز نے کہا ہم نہیں بتاتے تم لوگ خود دیکھو، لیکن وفور جذبات میں سب سے بے حال وہی نظر آتی تھیں۔

اور بے شک آنے والی کتاب کا دیباچہ ہم نے وہیں دیکھ لیا۔ چینی اور پاکستانی آرٹسٹ مغنّی اور رقاص بار بار بغل گیر ہو رہے تھے۔ گلے مل رہے تھے۔ جہاز کا وقت ہو رہا تھا لیکن ایک دوسرے سے جدا نہ ہو رہے تھے۔ جوان جہان لڑکیاں برہ کے ماروں کی طرح زار و قطار رو رہیں تھیں۔ فردوسی بیگم کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ سب کے سب گُلدستوں، پھولوں اور انواع و اقسام کے تحفوں سے لدے تھے۔ باہر باجا بج رہا تھا، کرتب ہو رہے تھے۔ کچھ کھلاڑی کاغذ کا ایک بڑا اژدھا لیے کہ چین کا قومی

نشان ہے، اپنے خاص طربیہ انداز میں اُسے نچا رہے تھے۔ اب یہ سب اور رُخصت کرنے والوں کی دورویہ قطار میں سے جلوس کی صورت گذرے۔ ان کے پیچھے پیچھے اس انداز رخصتی کو تقریب پذیرائی بنا کر ہم بھی چلے اور کچھ گجرے، کچھ نعرے اور بہت سی تالیاں ہمارے بھی حصّے میں آئیں۔ صاحبو! پاکستان سے چین جہاز ہفتے میں دو بار جاتا ہے۔ ایک بار ڈھاکے سے شنگھائی وہاں سے کینٹن اور پھر ڈھاکہ واپس۔ دوسری بار ڈھاکے سے پہلے کینٹن پھر شنگھائی اور وہاں سے سیدھا ڈھاکے۔ اس روز یہ دوسری پرواز تھی، لہٰذا شنگھائی تک ان تمام پاکستانی دوستوں کی معیّت رہی۔ راستے میں پیر صاحب کے حکم سے خمیسو خاں دیر تک الغوزہ سنایا کئے، سماں باندھ دیا۔

شنگھائی میں اترے ظلِّ الرحمٰن نے کہا۔ ''تمہارا اوور کوٹ کہاں ہے؟''

ہم نے کہا ''اوور کوٹ تو ہمارے پاس کبھی نہ تھا اور یہاں اس کی کیا ضرورت، یہ سوٹ کیا کافی نہیں؟ اور سویٹر بھی ایک ہے۔''

بولے، ''تمہاری مرضی، دیوارِ چین دیکھنے جاؤ گے تو تمہاری قلفی جم جائے گی۔''

قلفی ہمیں پسند ہے بشرطیکہ ہماری اپنی نہ ہو۔ لہٰذا ہم نے کھڑے کھڑے ظلِّ

الرحمٰن کا اوور کوٹ اُتروالیا۔ بولے "شوق سے لے جاؤ لیکن واپس کر دینا اور کہیں بھول نہ آنا۔"



اس پر اُن کے وفد کے ایک مغنّی کہ لاہور کے تھے لیکن ان کا نام نہیں معلوم، بے اختیار ہنس دیے۔ بولے۔ "خیر صاحب یہاں بھولنے کا امکان نہیں، آپ ہزار بھولیں یہ لوگ نہیں بھولنے دیں گے۔ اس سڑی ہوئی ٹوپی کو لیجئے جو آپ میرے قریب دیکھ رہے ہیں۔ اسے میں لے تو آیا تھا لیکن چونکہ دوسری بھی موجود تھی لہٰذا اسے پیکنگ کے ایک ہوٹل میں پھینک دیا۔ انہوں نے میرے پیچھے ہانگ چو بھیج دی۔ ہانگ چو میں میں اسے ایک پارک میں بنچ پر چھوڑ آیا۔ کسی نے اُٹھا کر جھاڑ پونچھ کر یہاں کینٹن بھیج دی۔ اب ڈھاکے میں جا کر اس سے چھٹکارا حاصل کروں

گا۔ عذاب بن گئی ہے میرے لیے۔"

شنگھائی۔۔۔ وہ شہر غدّار کہ انقلاب سے پہلے اپنے قحبہ خانوں، نائٹ کلبوں، اہلِ یورپ کے استحصال اور مقامی باشندوں کی نکبت اور افلاس کی بنا پر سینۂ چین کا ناسور کہلاتا تھا۔ حدِّ نظر تک ہمارے سامنے پھیلا تھا۔ یہ ہمارے سفر کا دوسرا پڑاؤ تھا یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔ یہاں شنگھائی کی انجمن مصنّفین کی طرف سے ایک صاحبہ ہمارے خیر مقدم کو موجود تھیں۔ سامان وغیرہ چھڑوانے کے لیے انہوں نے ٹکٹ ہم سے لے لیے اور کہا اس دوران میں ماحضر تناول فرمائیں۔

پہلی منزل کے اس شاندار اور دلکشا ریستوران میں یہ طے کرتے اور آپس میں بحث کرتے کہ چینی کھانے کی بسم اللہ کی جائے یا ولایتی کی فرمائش کریں، پندرہ منٹ گزر گئے۔ چینی کھانے میں احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ ترجمان کوئی آس پاس نہ تھا اور ہم میں سے مینڈک وغیرہ کوئی نہ کھاتا تھا۔ خیر پندرہ منٹ بعد جو بھی کھانا آیا خواہ وہ چین کا تھا یا مغربی، ہمارے لیے تھا یا کسی اور کے لیے، سب نے بڑی رغبت سے نوشِ جان کیا اور اب ہم پھر سفر کے لیے تیار تھے۔ شنگھائی سے پیکنگ کے لیے چینی فضائی کمپنی کا جہاز تھا۔

پیکنگ جانے والے اس جہاز میں ہمارے علاوہ بس دو چار اور مسافر تھے۔ ایک ننھی مُنّی لڑکی ائیر ہوسٹس تھی۔ برس پندرہ یا سولہ کا سن۔ کم از کم ہمارا اندازہ یہی تھا لیکن اس سے پوچھا تو اس نے بائیس سال بتائے۔ ہمیں چین کے قیام میں بارہا شبہ ہوا کہ جس طرح ہمارے ہاں آدابِ مجلسی کا تقاضا ہے کہ اپنی عمر پانچ سات برس کم کر کے بتاؤ، خصوصاً آپ خاتون ہیں، تو اسی طرح چین کے ضابطۂ اخلاق کے بموجب اپنی عمر بڑھا کر بتانا مستحسن خیال کیا جاتا ہو گا۔ لیکن تحقیق پر حقیقت یہ نکلی کہ لوگ بدن چور ہیں۔ ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ لیکن صاحبو اب گفتگو کے دفتر تہہ کرو کہ شہروں کا شہر پیکنگ آیا جاتا ہے۔ وہ پیکنگ جس کا ذکر ہم نے پہلے پہل حاتم طائی کے قصّوں میں پڑھا تھا۔ اپنے دوست منیر شامی کی محبوبہ کے ایک سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے اس اولوالعزم کو یہاں بھی آنا پڑا تھا۔ مارکو پولو یہاں بارہویں صدی عیسوی میں آتا ہے اور قبلائی خاں کے دربار میں سند و خلعت پاتا ہے۔ وطن واپس جا کر اس شہر کا احوال اس نے رقم کیا تو زمانہ وسطیٰ کے یورپ نے جو ابھی جہالت اور مذلت کی دلدل میں تھا، اسے دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے کے لقب سے نوازا۔ ابن بطوطہ اس کے کوئی آدھی صدی بعد آتا ہے اور اب ہماری باری ہے۔ لیکن ہم تو کراچی سے صبح چلے اور ہنستے کھیلتے، چائے پیتے، لنچ کھاتے،

حفاظتی بند کھولتے باندھتے شام کو پیکنگ میں جا اترے۔ مارکوپولو کو اس مسافت میں کئی برس لگے اور پھر اس عرصے میں نہ اس کو پیچھے والوں کی خبر تھی نہ پیچھے والوں کو اس کی۔ بلکہ قبلائی خان نے خطا کی، ایک شہزادی کو دلہن بنا کر ایران کے ایک شہزادے کے لیے مارکوپولو کی معیّت میں بھیجا تو منزل پر پہنچنے پر پتہ چلا کہ شہزادہ نامدار کو وفات پائے تو مدّت ہوئی۔ خیر سفر ان لوگوں کا حق تھا۔ ٹکٹ کٹا کر پل جھپکنے میں زمین کی طنابیں کھینچ لینا سائنس کا کمال تو ہوا، ہمارا تو نہ ہوا۔

پیکنگ کے ہوائی اڈے پر چینی ادیبوں کا ایک پورا جتھا خیر مقدم کو موجود تھا۔ ٹکٹ ہمارے ان میں سے ایک صاحب نے سنبھالے اور ہم ایک مکلّف ویٹنگ روم میں صوفوں پر جا بیٹھے۔ یہاں فوراً ہی چائے آگئی۔ چینی چائے جس میں نہ چینی ہوتی ہے نہ دودھ اور جو ہماری واپسی تک ہماری رگوں میں گیلنوں کی مقدار میں دوڑ رہی تھی۔ میزبانوں نے اپنا تعارف کرایا۔ یہ رسمی کاروائی تھی۔ سنتے گئے اور ہوں ہاں کرتے گئے۔ اگلی صبح تک سب ایک دوسرے کا نام بھول چکے تھے۔ مہمانوں کا تعارف کرانا ہمیشہ ہمارے ذمہ رہا۔ کیونکہ وفد کے لیڈر اراکین کے ناموں اور کاموں سے ابھی پوری طرح واقف نہ تھے۔

ایک آدم جگہ البتہ شمع ان کے سامنے پہنچی تو انہوں نے ہمیں پاکستان کی ممتاز اور

مشہور ناول نویس قرار دیا اور چونکہ تردید کرنا خلافِ آداب تھا، لہٰذا ایک میزبان کے اشتیاق آمیز استفسار کے جواب میں ہمیں اپنے ناولوں (آگ کا دریا، خدا کی بستی، آنگن وغیرہ) کی تعداد بتانی پڑی۔ وہ ان تصانیف کے نام بھی نوٹ کرنا چاہتے تھے لیکن ہم نے از راہِ انکسار کہا کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔

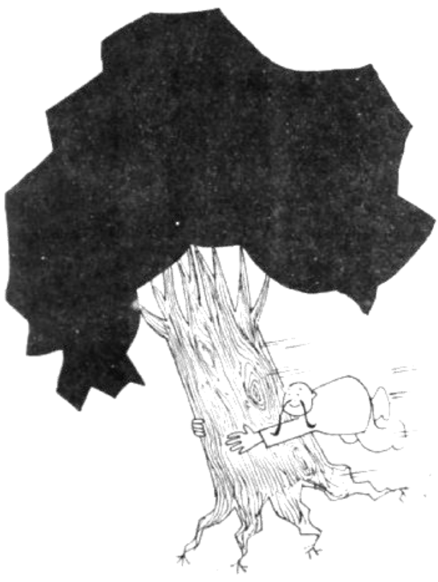
پرنسپل ابراہیم خاں ہمارے بار بار کے تعارف کے باوجود اہلِ چین کے لیے مسٹر خان ہی رہے اور ان کو یہی گمان رہا کہ پاکستان میں خان نام کے سبھی لوگ ایوب خاں، صبور خاں، خمیسو خاں وغیرہ ان کے اعزّہ ہیں۔ جسیم الدّین کو وہ لوگ مسٹر الدّین UDDIN کہنے پر مُصر تھے۔ آخر ہم نے کہا ان کو فقط جسیم کہہ لیا کرو۔ کوئی بے حرمتی کا احتمال نہیں۔ راشدی صاحب کے نام سے انہوں نے صرف الف گرادیا کہ یوں بھی حرفِ عِلّت ہے اور حسبِ ضرورت ہمارے ہاں بھی گرایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق کو مسٹر ہک ہونا ہی تھا۔ ڈاکٹر قریشی فقط ڈاکٹر کوائی چی بنے رہے۔ وقار عظیم صاحب مسٹر عظیم سے آگے نہ بڑھے بلکہ ہمارے رئیس وفد نہ جانے کیوں ان کو آخر تک باقر عزمی ہی کہتے رہے۔ اعجاز بٹالوی کو کسی نے مسٹر باٹلوی کے علاوہ کچھ نہ کہا۔ ہم نے کہا اور رکھو وطن کی نسبت۔ اچھے خاصے اعجاز سے باٹلوی بن گئے لیکن وہ اس میں خوش تھے۔ ہمارا نام سب کو آسان نظر آیا۔ مسٹر انشا

بولنے میں سب ٹھیک تھا لیکن اس لکھے کو کوئی پڑھتا تھا تو مسٹر ہنسایا یا اینسا بن جاتا تھا۔ مسٹر کے لیے ان کے ہاں کوئی لفظ ہے جو صاحب کی طرح نام کے بعد آتا ہے، پہلے نہیں۔"

گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے کہ ہم فرود گاہ سے قیام گاہ کو چلے۔ خاصی مسافت تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہ اپریل کی بیسویں کا ذکر ہے اور یہ ایّام شمالی چین میں خوشگوار سردی کے گنے جاتے ہیں ورنہ مہینہ بھر پہلے تک تو برفباری اور سردی نے لوگوں کو مرزا پھویا بنا گھروں میں قید کر رکھا تھا۔ آدھی رات کا عمل تھا لیکن سڑکوں کے دو رویہ کام کرنے والے کام کر رہے تھے۔ روشنی کے بڑے بڑے ہنڈے رات کو دن بنائے ہوئے تھے۔ ٹریکٹر اور بُل ڈوزر خرد شاں اور رواں دواں تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد کی نظم 'رات کا سماں' یاد آئی جس میں شب کا سرور چور تک کو اس کے فرائضِ منصبی سے غافل کر کے سُلا دیتا ہے اور یہاں شاہ تک بیدار تھے اور ملک کی دولت بیدار میں اضافے کی دھن میں پلک نہ جھپکا رہے تھے۔

لیکن ہم تو دیارِ دُور کے مہمان تھے اور نیند ہمیں پیاری تھی۔ کتنے ہی کوچے اور راہیں طے کرتے ہم ایک عظیم الشّان عمارت کی دہلیز پر تھے۔ چینی میں کیا نام ہے؟ یہ تو ہمیں کبھی یاد نہ رہا لیکن دائمی امن کی شاہراہ پر یہ ہوٹل یا قیام گاہ قومی اقلیتوں کا

ہوٹل کہلاتی ہے۔ اوّل درجے کا ہوٹل۔ کمرے پہلے سے مقرر تھے۔ کپڑے بدلنے کے بعد ہم یہ بھی نہ طے کر پائے تھے کہ آج کون سا خواب دیکھا جائے کہ نندیا دیوی نے ہماری آنکھیں موند دیں۔





کچھ چین کے الہ دینوں اور جنوں کے بارے میں

پرانی حکایت ہے کہ ایک پیر مرد دقیانوس، بُڈھے پھُوس، ستّر اسّی برس کا سِن اللہ اللہ کرنے کے دن، اپنے گھر کے باہر آموں کے پیڑ لگا رہے تھے۔ ایک راہگیر، تو کون میں خواہ مخواہ، کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ اما بعد بولا کہ بابا اب کَے دن اور تمہاری زندگی ہے۔ ان درختوں کا پھل کھانے کو زندہ تھوڑا ہی رہو گے۔ ناحق کو زحمت اٹھاتے ہو۔ بڑے میاں نے بھنوؤں کی جھالریں ہٹا کر اجنبی کو دیکھا اور کہا کہ یہ تناور جغادری درخت جن کے پھل میں نے کھائے اور کھاتا ہوں میرے پرکھوں نے لگائے تھے۔ میں جو لگا رہا ہوں اس کا پھل میرے بچے پوتے کھائیں گے۔

درخت لگانا ایک سمبل ہے۔ ہم آج جس چیز کی بنا ڈالتے ہیں خواہ وہ کوئی باغ ہے یا

صنعت ہے یا نظام ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کا پھل کھانے کو ہم خود زندہ رہیں۔ یہ بات ہوتی تو ماؤزے تنگ اور اس کے ساتھیوں کو جو عمر کے آخری مراحل میں ہیں کبھی اتنے کشٹ اُٹھانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ مزے سے سوئٹزر لینڈ کے بنکوں میں موٹی موٹی رقمیں جمع کرا کے عیش کرتے۔ جائدادیں بناتے اور جب کبھی عوام کی طرف سے کوئی خطرہ پیدا ہوتا سات سمندر پار سے خدائی فوج داروں کو بُلاتے کہ بھیجو چھپّن کروڑ کی چوتھائی۔ آؤ فوجی اڈّے بناؤ اور اپنے وفاداروں کی پشت پناہی کا حق ادا کرو۔ کچھ خود کھاؤ کچھ ہمیں کھلاؤ۔

لیکن دوستو! یہ موقع اس قسم کی گفتگو کا نہیں، یہ تو سیر پانچویں درویش کی ہے اور تقریب اس ذکر کا یہ کہ پہلے ہی روز ہم جو پیکنگ کی سڑکوں پر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اسکول کے لڑکوں کے غول کے غول ٹہنیاں، پودے، قلمیں اور پیڑ ہاتھوں میں اُٹھائے شجر کاری میں مصروف ہیں۔ چہروں پر ذوق و شوق اور چلبلاہٹ، ایک سے دوسرا بازی لے جانے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں وہ دن یاد آ گئے جب پرائمری کی جماعتوں میں پڑھتے ہوئے ہماری پوری کلاس کھیتوں میں نکل جاتی تھی اور دو دو میل تک پوہلی کاٹتی چلی جاتی تھی۔ یہ ایک خاردار بوٹی ہوتی ہے جو پھیل جائے تو فصل کا بڑا نقصان کرتی ہے۔ اس عالم میں نہ دھوپ کا خیال ہوتا تھا نہ کسی

صلے کی توقع۔ سو یہی جذبہ ہم نے ان سیکڑوں ہزاروں طالب علموں میں دیکھا جو سڑکوں کے گرد درخت لگاتے ہیں۔ چائے کے باغوں میں جا کر چائے چُنتے ہیں اور مضافات کے کمیونوں میں جا کر سبزیاں اور فصلیں بوتے اور کاشت کرتے ہیں۔ یہ رضاکار جتھے وہ کام کرتے ہیں جو تنخواہ دار کارگر صلے کے عوض نہ کر سکیں۔ ان کو نہ کہیں سے کھانا ملتا ہے نہ کوئی اور سہولت۔ دیکھا کہ کھانے کی پوٹلیاں ساتھ ہیں اور پیدل مارچ کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی ٹرک پاس سے گزرا تو لفٹ دے دی۔ بعض اوقات تو یہ لوگ ایک دو دن نہیں بلکہ ہفتے ہفتے بھر کے لیے باہر نکل جاتے ہیں، ہانگ چُو کے چائے کے باغوں کے کمیون میں ہم نے ایسی ہی ایک جمیعت دیکھی، یہ لوگ گھروں سے پانچ پانچ سات سات روپے لے کے نکلے تھے۔ کام کرتے تھے، کھیلتے تھے۔ سایۂ دیوار میں آرام کرتے تھے اور جس روز وہ ہمیں ملے ہیں ان کے بستر ایک ٹرک پر بار تھے۔ اس میں بھی قرار داد یہ تھی کہ سامان یہ ٹرک ایک خاص منزل میں پہنچا دے گا لیکن ساری نفری خود مارچ کرتی جائے گی۔ ۱۹۵۸ء تک پیکنگ میں خال خال درخت نظر آتے تھے لیکن ۱۹۲۰ء تک اس شہر میں نوّے لاکھ درخت لگ چکے تھے۔ اس کے بعد جو لگے ان کی گنتی معلوم نہیں۔ لیکن تعداد ایک کروڑ سے اوپر ہو گی۔ یہ لوگ سڑک کے دورویہ فاصلے فاصلے سے ایک درخت

لگانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بعض جگہ پانچ پانچ سات سات متوازی قطاریں چلی گئی ہیں۔ ایسی بھی شاہراہیں ہیں جن کے کنارے بیس بیس قطاریں ایک کے پیچھے ایک چلی گئی ہیں۔ درخت نہیں جنگل کہیے۔ شہر کے مرکز میں ان لوگوں نے چھوٹے پیڑ کاشت کرنے اور پھر سالوں انتظار کرنے کے بجائے یہ کیا ہے قد آدم بلکہ اس سے ڈیوڑھے دُگنے درخت اُکھاڑ لائے۔ پنجابی میں تو اسے چکلی نکالنا کہتے ہیں اردو اصطلاح معلوم نہیں۔ چکلی تو آج کل درختوں ہی کی نہیں عمارتوں کی بھی نکالی جاتی ہے۔ ماسکو میں عمارتوں کی عمارتیں، بلاکوں کے بلاک کھود کر ان کے نیچے آہنی شہتیر پھنسا کر اور ان میں پہیئے لگا کر کہیں سے کہیں منتقل کر دیے گئے۔ لیکن یہاں درختوں کا ذکر ہے۔ گڑھے پہلے کھود لیے جاتے ہیں۔ کرین درخت کو اُٹھا کر اس میں رکھ دیتی ہے اور مٹی برابر کر کے پانی دے دیا جاتا ہے۔ چند روز میں وہ جم جاتا ہے جیسے پانچ سات سال پہلے لگا ہو۔ یہ احوال ہم نے صرف پیکنگ میں نہیں سبھی شہروں اور قصبوں میں دیکھا۔ دعوتوں میں کہیں جامِ صحت تجویز کرنے کا موقع آیا تو ہم نے چین کے درخت کاروں ہی کے نام کیا جو سڑکوں اور کھیتوں میں فصلیں اور پیڑ کاشت کر رہے ہیں اور نئے ذہنوں میں عزم خود داری اور محنت دوستی کے نونہال۔

جغادری اور دیو ہیئت، عمارتوں کی تعمیر بھی اس ذوقِ تعمیر کا دوسرا پہلو ہے۔ ۱۹۵۹ء میں چین کے انقلاب کی دسویں سالگرہ تھی۔ ۱۹۵۸ء کے اواخر میں اس تقریب سے پیکنگ کے لوگوں نے عزم کیا کہ وہ دس عظیم الشّان عمارتیں بنائیں گئے اور دس مہینے کے اندر بنائیں گے۔ تاکہ یکم اکتوبر ۱۹۵۹ء کو دسویں یوم انقلاب پر وہ تیار ملیں۔ ان عمارتوں کی وسعت کا اندازہ کرنا ہو تو ہی جانیے کہ ایک ایک میں اسٹیٹ بینک اور نیشنل بینک کی کئی کئی عمارتیں سما جائیں۔ قمر ہاؤس کی سی بلڈنگیں تو جانے کتنی ہوں گی۔ ان دوس عمارتوں میں ایک تو عوام کا تالارِ عظیم ہے جو اپنی وسعت میں شاید دنیا بھر میں نظیر نہ رکھتا ہو۔ کوئی بڑا غیر ملکی مہمان، صدرِ مملکت یا وزیر اعظم وغیرہ آئے یا کوئی اہم تقریب ہو تو اس میں جلسہ ہوتا ہے اس کے کمرہ طعام کا اندازہ اس سے کیجئے کہ پانچ ہزار آدمی بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ ہال کی بالکونیوں میں دس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اور یہ مدّور بالکنیاں بلا ستونوں کے قائم ہیں۔ ابھی حال ہی میں افرو ایشیائی مصنّفوں کا جو ہنگامی اجلاس ہوا اور جس میں پاکستان کے نمائندے بھی شریک ہوئے ان کی دعوت بھی وزیر اعظم چو این لائی نے اسی عمارت میں کی۔ پیکنگ کا مرکز تائن من چوک ہے یہاں ایک پرانا تاریخی دروازہ ہے۔ جس کے پیچھے شاہی محلات ہیں۔ پرانے زمانے میں شاہی فرمان اس کی

بالکنی سے نیچے انتظار کرنے والے امراء، و وزراء اور حکامِ مملکت کو جھینکے جاتے تھے۔ عوامی جمہوریہ چین کا اعلان بھی ماؤزے تنگ اور اس کے رفیقوں نے اسی بالکنی سے کیا اور اس کا پرچم بھی پہلی بار یہیں کھلا جس کی یادگار بھی قائم ہے۔ پہلے یہاں کچھ چھوٹی موٹی عمارتیں تھیں۔ اب ان کی جگہ ایک بہت وسیع چوک ہے جس میں خاص موقعوں پر پریڈ بھی ہوتی ہے۔ اس چوک کو پیکنگ بلکہ چین کا دل کہئے۔ عوام کا تالارِ عظیم اسی کے ایک پہلو پر واقع ہے اور بالمقابل پہلو پر چین کی تاریخ اور چین کے انقلاب کے ڈھنڈار عجائب خانے ہیں۔ تالارِ عظیم کی وسعت اور اسلوبِ تعمیر نے بہت سے مغربی مبصّروں کو حیران کیا ہے۔ ان میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ صوتیات کا کوئی مسلّم یا مروج اصول ایسا نہیں جس سے انحراف کیا گیا ہو۔ اس کے باوجود اس کے ہر حصّے میں آواز یکساں طور پر سنی جاسکتی ہے۔ ہال کی دس ہزار نشستوں میں سے ہر ایک کے پیچھے ایک ننھا سا مائیکرو فون چھپا ہوا ہے۔ ہر نشست کے ساتھ کانوں کو لگا کر مختلف زبانوں میں ترجمہ سننے کے آلات بھی لگے ہیں۔ اگر تقریر چینی زبان میں ہو رہی ہے تو چاہے اس کا ترجمہ انگریزی میں سنئے، چاہے روسی میں۔ کچھ اور زبانوں کا بھی انتظام ہے، فقط ایک بٹن دبانا ہو گا۔

اس عمارت کی تعمیر میں چودہ ہزار آدمی، کاریگر اور کارندے وغیرہ تو لگے ہی تھے

لیکن پیکنگ کے لوگ بھی رضاکارانہ آ کر کام میں جُٹ گئے۔ شاموں کو اور اتوار وغیرہ کو ہزاروں شہری آ کر ہاتھ بٹاتے رہے اور اب فخر سے کہتے ہیں کہ ہاں ہمارا ہاتھ بھی اس کی تعمیر میں ہے۔ فلیکس گرین کہتا ہے کہ اگر یہ ہال دس سال میں بھی پایۂ تکمیل کو پہنچتا تو تعمیرات کا ایک شاندار کارنامہ قرار پاتا لیکن دس ماہ میں اس کا بننا ایک عجوبہ سے کم نہیں۔



یہ تحیّر دوسری عمارتوں کو دیکھ کر ہوتا ہے کہ ان دس ماہ میں بنیں۔ چین کی تاریخ اور انقلاب کے عجائب گھروں کا ذکر ہم تفصیل سے کریں گے۔ انہیں دیکھ کر بھی اللہ کی قدرت یاد آتی ہے۔ قومیتوں کا محل بھی اپنی شان کی ایک ہی عمارت ہے اور ہمیں خیال ہوتا ہے کہ وہ ہوٹل بھی جس میں ہم قیام فرماتھے اس منصوبے میں شامل تھا۔ پیکنگ کا نیا اور بے مثال ریلوے اسٹیشن بھی انہی دس ماہ میں بنا، بلکہ دس ماہ میں نہیں ساڑھے سات ماہ میں۔ اس کے متعلق بھی ہمارااندازہ ہے کہ کہ اگر پانچ سات برس میں بنتا تو قابلِ تعریف کارگزاری ہو گی، لیکن ساڑھے سات ماہ میں؟ اگر لوگ آنکھوں دیکھی نہ کہیں تو کبھی یقین نہ آئے۔ ایک صاحب ۱۹۵۸ء کے اواسط میں وہاں تھے تو کچھ نہ تھا۔ ۱۹۵۹ء کے یومِ انقلاب پر گئے تو حیرانی ہی حیرانی۔ الہ دین نے اپنی عروس کے لیے رات بھر میں محل کھڑا کر دیا تھا جو اس کے چراغ کے جن کا کارنامہ تھا۔ الہ دین چینی تھا اس کا جن بھی چینی ہو گا۔ لہٰذا خیال ہوتا ہے کہ ایسی باتیں چین میں ہی ہو سکتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ چراغ غیر کے قبضے میں گیا تو الہ دین کا محل بھی غائب ہو گیا۔ ماؤزے تنگ کا چراغ محنت کا جادو ہے اسے زوال نہیں۔ اسی محنت کو چراغ جانیے۔

عجائب نئے اور پرانے

پیکنگ کا ریلوے اسٹیشن اپنے جلال و جمال میں ایک نادرہ کار عمارت ہے۔ سامنے کے چوگان میں جہاں قاعدے کے مطابق کیلے اور مونگ پھلیوں کے چھلکے، چاٹ کے خالی دونے، پان کی پیکیں، سگریٹ کے ٹکڑے اور دوسری غلاظتوں کے ڈھیر ہونے چاہیں، آپ کچھ بھی نہ پا کر مایوس سا ہو جائیں گے، کیا مُجلّا اور دھلا دھلایا فرش ہے۔ اندر داخل ہو کر ایوان کی چھت پر نظر ڈالنے کے لیے، آپ کے پاس پگڑی ہے تو پگڑی سنبھالیے، ٹوپی ہے تو ٹوپی۔ احتیاط کیجیے۔ فرش پر پاؤں نہ پھسل جائے۔ یہاں آپ کو چین کے طول و عرض کے بھانت بھانت کے لوگ مل جائیں گے۔ کچھ کام کی نیلی وردی میں، کچھ روئی کی بنڈی یا مرزئی پہنے، کوئی شمال کا ہے، کوئی جنوب

کا۔ سنکیانگ کے لوگ تو دور ہی سے پہچانے جائیں گئے۔ السّلام علیکم کہیئے، و علیکم سلام کہیں گے۔ اس کے بعد نہ آپ ان کی بات سمجھ سکیں گے نہ وہ آپ کی۔ زیادہ سے زیادہ آپ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر پاکستان کہیے۔ (چینی لوگ پاچستان کہتے ہیں) وہ سنکیانگ کہے گا۔ سامان خود اٹھائے ہوئے ہیں۔ اب ایوان کے دونوں سروں پر آپ بجلی کی سیڑھیاں (ایسکے لیٹر) دیکھیں گے، ان پر چڑھ کر ٹکٹ گھر کی کھڑکیوں اور آرام گاہوں تک پہنچے۔ کچھ ان میں سے زیریں منزل پر ہیں۔ اوپر پہلی منزل کے فرشتوں پر بھی اتنی صفائی اور جلا ہے کہ ہم جیسوں کا جی گھبرا جائے، دورویہ بڑے لمبے لمبے تالارِ ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب۔۔۔۔ یہاں ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اپنا ہی قطع کلام کر کے کچھ چین کے ضابطۂ اخلاق کے متعلق عرض کریں۔ اگر آپ کو کوئی جگہ دیکھنی ہے۔ یونیورسٹی ہے یا لائبریری، عجائب گھر یا کارخانہ، اسکول یا ریلوے اسٹیشن تو آپ کے میزبان متعلقہ افسر اعلیٰ کو فون کر دیں گے کہ ہم فلاں وقت پہنچیں گے۔ افسرِ اعلیٰ وقتِ مقرہ سے پانچ منٹ پہلے آپ کے خیر مقدم کے لیے باہر کھڑا ہو گا۔ اس کے لیے یہ کوئی شرط نہیں کہ آپ کوئی سرکاری مہمان یا بھاری بھرکم شخصیت ہیں۔ ماؤزے تنگ نے بھی آپ کو وقت دیا ہے تو دروازے پر آکر آپ کو خوش آمدید کہے گا۔ یہ نہیں کہ فرلانگ بھر چوڑی میز پر سے ہاتھ لمبا کر

کے آپ کی انگلیوں کو چھو لیا جائے۔ اگر آپ دیر کرتے ہیں تو اتنی دیر اُسے بھی انتظار میں کھڑا رہنا ہو گا۔ اس کے بعد سب سے پہلے آپ ایک مخصوص کمرے میں جاتے ہیں جہاں صوفے بچھے ہیں اور چائے اور سگرٹ حاضر ہیں۔ یہاں آپ کو بریف کیا جائے گا۔ یعنی ادارے کا تعارف کرایا جائے گا۔ پس منظر بتایا جائے گا۔ اس دوران میں اسے کتنا ہی ضروری کام ہو، وہ بے چینی ظاہر نہیں کرے گا۔ کسی ٹیلیفون کا جواب نہیں دے گا، بے صبری میں بار بار گھڑی نہیں دیکھے گا۔ ان لوگوں کی پابندی اوقات کا ہمیں شروع میں اتنا خیال نہ تھا۔ ہوتا بھی تو عادت سے مجبور تھے۔ ہمارے مستقل میزبان یعنی وہ جو ہماری خاطر داری کے لیے ہمارے ہمراہ رہتے تھے۔ اور ترجمان حضرات ہمیں یہ بتا کر کے نو بجے فلاں جگہ پہنچنا ہے، ہمیں لینے کے لیے پونے نو بجے پہنچ کر ہوٹل کی انتظار گاہ میں آ بیٹھتے تھے۔ ہماری منڈلی میں سے ایک آدھ آدمی نو بجے نیچے اُتر آتا تھا۔ دوسرا کوئی پانچ منٹ بعد چلا آ رہا ہے۔ تیسرا کوئی دس منٹ بعد بر آمد ہوتا ہے، اب گنتی ہوئی تو سات میں سے چھ موجود ہیں۔ فلاں صاحب باقی ہیں اور آخری اطلاع کے مطابق غسل خانے میں تھے۔ خدا خدا کر کے وہ آئے اور چلنے کی تیاری ہوئی تو ایک نہ ایک صاحب کو یاد آیا کہ میری پنسل یا میرے سگریٹ یا میری نوٹ بک کمرے میں رہ گئی ہے۔ ان کے

اپنے کمرے تک جانے اور شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر آخری بار کنگھا کرنے اور اپنی چیز تلاش کر کے لانے میں پانچ سات منٹ اور بیت جاتے، ایسا اکثر ہوا کہ وقت نو بجے کا دیا اور منزل پر ساڑھے نو بجے پہنچے۔ میزبان بیچارے کو آدھ گھنٹہ انتظار کرایا۔ ہم نے ساتھیوں سے ایک آدھ بار مؤدبانہ کچھ عرض کیا تو بولے ہم ان لوگوں کے لیے عمر بھر کی عادت بگاڑنے سے رہے۔

سو سلسلہ کلام کو وہیں سے جوڑتے ہوئے عرض کریں کہ اسٹیشن ماسٹر صاحب نے ہمیں آرام گاہیں بھی دکھائیں اور پلیٹ فارم بھی جو فرلانگ فرلانگ دو دو فرلانگ لمبے تھے۔ ہر منزل کی گاڑی کے لیے الگ الگ آرام گاہ ہے۔ کل سترہ آرام گاہیں یعنی سترہ ہزار آدمیوں کی گنجائش، ننھے منوں کے لیے دو نرسریاں اور بچوں کے کھیلنے اور دل بہلانے کے لیے چار کمرے ان کے علاوہ ہیں۔ نرسریوں میں بچے سوتے ہیں اور نرسیں ان کی خبر گیری کرتی ہیں۔ بڑے بچے جھولا جھولتے ہیں یا کوئی کھیل کھیلتے ہیں اور جاتے میں ماں ان کو وہاں سے لے لیتی ہے۔ پلیٹ فارم پر اس وقت ماسکو جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ معلوم ہوا ایک دن اور رات کی منزل ہے۔ جب سے روس اور چین کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی ہے اس راستے پر ٹریفک کم ہو گیا ہے۔

اس اسٹیشن پر ٹیلی وژن کا ایسا انتظام ہے کہ مختلف پلیٹ فارموں اور آرام گاہوں کا نظارہ ایک مرکزی کمرے میں بیٹھے بیٹھے کیا جا سکتا ہے۔ ایک کھڑکی معلومات کی بھی ہے جس میں کوئی نہیں ہوتا۔ یہ نہ سمجھئے کہ ہمارے ہاں کی طرح کہیں چائے پینے گیا ہوتا ہے، بلکہ ہوتا ہی نہیں۔ ہم نے اسٹیشن ماسٹر صاحب سے پوچھا کہ پھر جواب کیسے ملتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کھڑکی کے سامنے پاانداز رکھا ہے اس پر کھڑے ہو جایئے۔ کھڑے ہوتے ہی اندر سے ایک شیریں آواز آئے گی "فرمایئے" آپ پوچھئے وہ جواب دے گی۔ ہمیں پوچھنا تو کچھ نہ تھا ہم نے کھڑے ہو کر "نی ہاؤ۔ نی ہاؤ" یعنی مزاج شریف کہہ دیا۔ اس کے جواب میں اُدھر سے کچھ کہا گیا۔ ہمارے ترجمان نے اس کا یوں ترجمہ کیا کہ "اے اجنبی مہمان ہم تیرا خیر مقدم کرتے ہیں۔"

اور یہ ہے پیکنگ کا عجائب گھر۔ عمارت ایک ہی ہے لیکن دو حصّوں میں بٹی ہوئی۔ داہنے حصّے میں چین کی تاریخ کا عجائب گھر ہے اور بائیں میں چینی انقلاب کا عجائب خانہ۔ پہلے حصّے میں لاکھوں سال قبل مسیح سے شروع ہو کر ۱۸۴۰ء تک کے عجائب ہیں اور انقلاب والے حصّے میں اس کے بعد سے ۱۹۴۹ء تک کی یادگاریں۔ ۱۸۴۰ء وہ سال ہے جب کہ جنگ افیم کا آغاز ہوا۔ یعنی انگریزوں نے چینیوں پر زبردستی افیم

مسلط کرنے اور ناجائز مراعات حاصل کرنے کے لیے چین سے جنگ لڑی اور جیتی اور ۱۹۴۵ء عوامی جمہوریہ چین کا سال تاسیس۔

یہ عمارت ان دس عالی شان عمارتوں میں سے ہے جو انقلاب کی دسویں سالگرہ کے لیے دس ماہ میں تیار کی گئیں۔ یہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں بننی شروع ہوئی اور اگست ۱۹۵۹ء کو مکمل۔ تاریخِ چین کا میوزیم تین حصّوں میں تقسیم ہے۔ ایک زمانہ قدیم کا ہال جو پانچ لاکھ سال پہلے سے شروع ہو کر اب سے چار ہزار سال پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا غلام معاشرے کا ہال جس کا دور اکیسویں صدی ق م سے ۴۷۵ء تک محیط ہے۔ تیسرے حصّے میں جو جاگیرداری دور سے متعلق ہے ۴۷۵ ق م سے ۱۸۴۰ء تک کے آثار محفوظ ہیں۔

دورِ قدیم زیادہ تر عہد پاستان کے آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے اسکالروں کی دلچسپی کی چیز ہے۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا بھی کہ یہ کیا صراحیاں اور پیالے اور کچھ انجر پنجر جمع کر دیئے ہیں۔ خیر انہی دوست نے موہنجوداڑو کے آثار کے متعلق بھی اسی رائے کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ ”ایسے پیالے اور مٹکے تو ہمارے گاؤں کے کمہار بھی بنا لیتے ہیں ان میں کون سرخاب کا پر لگا ہے۔“ پانچ چھ ہزار سال پرانے باجرے اور گیہوں کے دانے بھی محفوظ ہیں۔ یہ لوگ پرانے مصریوں کی طرح

مُردے کے ساتھ طرح طرح کی نعمتیں بھی دفن کر دیتے تھے تاکہ وہ مرنے کے بعد دوسری دنیا میں عیش کرتا رہے۔ ان نعمتوں کے جوں کے توں بر آمد ہونے سے خیال ہوتا ہے کہ مردے انہیں استعمال کرنا پسند نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے۔

دورِ غلامان (۲۱ ویں صدی ق م تا ۴۵۸ ق م) میں زراعت ترقی پزیر ہوئی۔ ریشم کے کیڑے پالے جانے لگے اور ریشم کا کپڑا بننے لگا۔ دن مہینوں کے حساب کے لیے با قاعدہ تقویم بنی۔ پیتل کے برتن اور اوزار وجود میں آئے۔ روغن مٹی کا کام بھی ہونے لگا۔ رَتھ اور ناؤ کے لفظ اس دور کے کتبوں میں ملنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں بھی تھیں۔

لیکن یہ دور بہر حال غلاموں کا دور تھا جن کو زندگانی کے کوئی حقوق نہ حاصل ہوتے تھے۔ بعض اوقات مرنے والے امیر کے ساتھ اس کے غلاموں کو بھی قتل کر کے دفنا دیا جاتا تھا تاکہ دوسری دنیا میں اس کی مٹھی چاپی کر سکیں۔ کنفیوشس اور لاؤزے اس دور کے آخری ایّام میں پیدا ہوئے اور اس کے بعد جاگیر داری عہد کی ابتدا ہوتی ہے۔

اتنے بڑے ملک کی تاریخ کو کوزے میں بھی بند کرنا ہو تو بہت بڑا کوزہ درکار ہو گا۔

ہم اس قسم کا خلاصہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ جیسا ایک بزرگ نے حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام کے قصے کا کیا تھا کہ "پدرے بود سپرے داشت گم کرد بازیافت" تیسری صدی قبل میں شہنشاہ والا قدر شیہہ ہوانگ تی سے آغاز کیجئے جس نے شہنشاہ اوّل کا لقب اختیار کیا۔ اس نے حکم دیا کہ طب، زراعت اور نجوم کو چھوڑ کر بقیہ سبھی علوم کی کتابیں نذرِ آتش کر دی جائیں۔ خیر پروہتوں اور عالموں نے کچھ صحیفے چھپا لیے اور وہ بچ گئے ورنہ آج کنفیوشس کا نام بھی کوئی نہ جانتا لیکن اس نے ایک بڑا کام کیا اور وہ ہے دیوارِ چین کی تعمیر۔

اس کے بعد دو خاندان مشہور ہیں۔ ہان خاندان (۲۰۶ق م تا ۲۲۰ق م) اور تانگ (۶۱۸ء تا ۹۰۹ء)۔ ہان دور میں کلاسیکی ادب کو حیاتِ نَو ملی۔ بدھ مت آیا۔ مجسمہ سازی اور کاغذ سازی شروع ہوئی۔ چینی خود کو آج بھی ہان ہی کہتے ہیں۔ تانگ دور اس سے بھی زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اسی میں چھاپا خانہ ایجاد ہوا۔ شاعری، مصوری اور چینی ظروف کی نقّاشی عروج کو پہنچی۔ یہ چین کی تاریخ کا سب سے شاندار دور سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت یورپ میں عہدِ تاریک تھا۔ اس کے بعد سونگ دور (۱۲۸۰ء تا ۱۹۶۰ء) آیا۔ یہ آرٹ خصوصاً مصوری کے لیے مشہور ہے۔

تیرہویں صدی میں جب یورپ میں صلیبی جنگیں ہو رہی تھیں، منگول دیوارِ چین کو

توڑ کر سونگ خاندان کو تتّر بتّر کر کے شمالی چین پر چھا گئے۔ چنگیز خاں نے ۱۲۱۴ء میں پیکنگ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے جانشین قبلائی خان نے ۱۲۳۵ء سے ۱۲۹۴ء تک راج کیا اور جنوبی چین تک اس کے تسلط میں آ گئے۔ مارکو پولو اسی شہنشاہ کے دربار میں آیا تھا۔ ۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء تک پھر ایک چینی خاندان منگ آتا ہے اور سترہویں صدی میں عنانِ حکومت مانچو خاندان کے ہاتھ آئی۔ یہ آخری شاہی خاندان تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اس کا خاتمہ ہوا اور سن یات سن کی قیادت میں جمہوری دور شروع ہوا۔ آخری مانچو بادشاہ جو معزولی کے وقت صغر سن تھا اب بھی زندہ ہے اور نئے چین میں عام آدمی کی لیکن خوش باش زندگی بسر کر رہا ہے۔

تاریخِ چین کا عجائب گھر ان تمام ادوار کے آثار سے پُر ہے۔ ۱۹۰۱ء میں جب آٹھ سامراجی ملکوں کی فوجوں نے پیکنگ پر حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کیا تو ادب اور آرٹ کے خزانے بھی لوٹ لیے گئے جو اب مغربی ملکوں کے عجائب گھروں کی زینت ہیں۔ اس کے باوجود باقیات کی وسعت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ چین کے مختلف شہروں کے عجائب گھروں اور شاہی محلوں میں ایوان کے ایوان مصوری، نقّاشی اور ظروف سازی کے شاہکاروں سے پُر ہیں۔ ان ذخیروں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم نے ایرانی مصوری اور راجپوت

مصوری کے نمونے دیکھے ہیں لیکن وہ کتنے ہیں اور کیسے ہیں۔ ع ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں۔ چینیوں نے مصوری اور شاعری کے علاوہ صدیوں پہلے کی انجینئری کے بڑے بڑے کارنامے چھوڑے ہیں۔ دیکھا جائے تو عہد عباسی کے فضلا اور سائنسدانوں کے بعد جب معقولات کو زوال آیا تو ایران میں صفوی دور اور ہندوستان میں اکبر تا شاہجہاں کے دور کے جزیروں کو چھوڑ کر باقی ظلمات کا دریا نظر آتا ہے۔

دونوں عجائب گھروں میں چیزیں اس نفاست اور سلیقے سے سجی ہیں کہ جی خوش ہوتا ہے اور لطف کی بات ہے کہ ڈائریکٹر صاحب انگریزی یا کسی مغربی زبان کا ایک بھی لفظ نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے ساری تعلیم چینی زبان میں چین کے اندر ہی حاصل کی۔ ہماری خاصی دلچسپی کی چیز چینی انقلاب کا عجائب خانہ تھا جو جنگ افیم ۱۸۴۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں انگریزی فوجوں کے رایت و پرچم، ہتھیار اور خود سب موجود ہیں اور حریت پسندوں کی باقیات بھی جو زیادہ تر نیزوں، تلواروں اور کلہاڑیوں سے لڑتے تھے۔ اس کے بعد تائے پنگ بغاوت (۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۵ء) اور باکسر بغاوت (۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۱ء) کے آثار باقیہ دیکھے۔ بعد ازاں کامن تانگ یعنی چیانگ کائی شیک کی افواج قاہرہ کے خلاف جدوجہد اور جاپانیوں سے گوریلا جنگ کی

نشانیاں ہیں۔ ان میں لانگ مارچ اور سرنگوں کی لڑائی کو ماڈلوں کے ذریعے دکھایا گیا ہے جو خاص دلچسپی کی چیز ہے۔ چین کی تاریخ اور چین کے انقلاب کے عجائب خانوں کے علاوہ ایک فوجی عجائب خانہ الگ ہے جس میں جاپانیوں اور امریکیوں سے چھینا ہوا اسلحہ ہے اور ایک احاطہ میں ان امریکی جہازوں کے ڈھانچے کھڑے ہیں جنہیں چینیوں نے مختلف اوقات میں اپنے علاقے میں مار گرایا۔

ان سب میں طالب علموں اور مضافات کے دیہاتیوں کے ہجوم دیدنی تھے۔ یہ عجائب گھر فقط تاریخ ہی نہیں سکھاتے۔ نظری اور سیاسی تعلیم کا بھی ذریعہ ہیں۔ بڑے دروازے سے داخل ہوتے ہی مارکس اینگلز اور لینن کے ساتھ اسٹالین کی تصویر دیکھ کر ایک بار تو سب ٹھٹک گئے۔ وہی اسٹالین جو مغربی دنیا میں تو مقہور تھا ہی اب اپنے وطن میں بھی مردود ہے۔ چینیوں نے اسے سینے سے لگا رکھا ہے۔ اس کی کتابوں کو بار بار چھاپتے ہیں اور اس کی تصویر ہر پبلک مقام پر حتیٰ کہ ہر کمیون میں ملتی ہے۔ ماؤزے تنگ کو اس میں پانچویں سوار کے طور پر شامل نہیں کیا جاتا بلکہ الگ ایک ممتاز جگہ دی جاتی ہے۔ ہر جگہ اس کے اقوال نظر آتے ہیں۔ قومی عجائب گھر میں اس کا ایک قول مشہور شاعر اور چین کے نائب صدر کوموجو کے اپنے ہاتھ بلکہ برش کا لکھا ہوا آویزاں ہے۔ پیکنگ اپنی جگہ ایک بلدۂ آثار صنا دید ہے۔ یہاں

اور بھی چھوٹے بڑے عجائب خانے ہیں لیکن وہ دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ ہمارا قلم ان کی تصویر کہاں تک کھینچ سکتا ہے۔ فلم ہو تو شاید انصاف کا کچھ حق ادا کرے۔

اور اب اے صاحبو! اٹھاؤ ڈھول اور تاشے اور چلو ہمایوں کے مقبرے۔ یعنی چار دیواریوں سے نکلیں اور کھلی فضا کی سیر کے لیے ذرا دیوارِ چین تک چلیں جو پیکنگ سے کوئی چالیس میل کی مسافت پر ہے۔

ذرا دیوارِ چین تک

اپریل مہینے کی چوبیس تھی اور اتوار کا روز کہ ہم علی الصبح دیوارِ چین کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ یہ پیکنگ سے کوئی پچیس تیس میل کی دوری پر ہے اور چین کا لاکھوں مربع میل علاقہ اس کے شمال میں پھیلا ہے۔ اب سے بائیس تیئس سو برس پہلے جب یہ بنی تھی تو اس کا مقصد شمال سے تاتاریوں کے حملے کو روکنا تھا۔ تحقیق کہتی ہے کہ جہاں تہاں دیواریں تو مختلف حکمرانوں نے پہلے ہی کھڑی کر رکھی تھیں۔ ہاں شہنشاہ اوّل چن شہ ہوانگ تی نے ۲۱۴ ق م میں ان کو مربوط کیا۔ ان پر بُرج بنائے اور دھوئیں کے سگنل دینے کا طریقہ رائج کیا جو اس کے پایۂ تخت سیان سے نظر آ سکیں۔ چین والے اپنی زبان میں اس کو دس ہزار میل لمبی دیوار کہتے ہیں، لیکن فی

الحقیقت یہ ڈیڑھ ہزار میل کے لگ بھگ ہے۔ کہیں یہ پندرہ فٹ اونچی ہے کہیں پچاس فٹ۔ کچھ حصّہ بڑی بڑی اینٹوں سے بنا ہے کچھ پتھروں سے۔ دیوار کے زیادہ تر حصّے کے ساتھ ایک بیرونی خندق بھی کھدی دکھائی دے گی۔ یہ ڈیڑھ ہزار میل کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا ہے۔ کہیں سے ریل درّاتی گذرتی گئی ہے، کہیں سڑک بن گئی ہے۔ کہیں امتداد زمانہ نے شکست وریخت کا عمل کیا ہے لیکن جہاں سے ہم نے اسے دیکھا اور اس پر چڑھے وہاں سڑک اُسے کاٹ کر نہیں بلکہ اس کے نیچے سے گزرتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کے آپ ایک بُرج پر پہنچتے ہیں جس پر چھت بھی ہے۔ وہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے اور فرش اینٹوں کا ہے۔ یہ اینٹوں کا فرش بعد کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ چودھویں اور سولھویں صدی میں بھی اس کی مرمت ہو چکی ہے۔ بایں ہمہ نیچے کے آثار ضرور دو ہزار برس سے زیادہ پرانے ہوں گے۔

یہاں سیر کو آنے والوں کا ہمیشہ ہجوم رہتا ہے اور اتوار کو بالخصوص۔ زیادہ تر لوگ ریل سے آتے ہیں اور ریل کے اسٹیشن سے جو غالباً میل بھر دُور ہے۔ پیدل۔ اس کے بعد میلوں تک چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس روز سردی بھی خاصی تھی۔ یہاں میاں ظلّ الرحمٰن کا کوٹ کام آیا۔ ہمارے لیڈر پرنسپل ابراہیم خان نے اونٹ کے رنگ کا ایک ڈریس گون نکالا جو اوور کوٹ کا بہت عمدہ کام دے رہا تھا۔ چونکہ اس پر

ریشمی دھاگے کی کشیدہ کاری بھی تھی لہذا سب نے ان کو خاقانِ چین کا خطاب دیا۔ ہماری پارٹی کے زیادہ تر لوگ پچاس ساٹھ ستّر کی عمر کے دائرے میں تھے وہ تو بُرج کی منڈیر پر بیٹھ گئے، ڈاکٹر وحید قریشی باوجود اپنی جوانی کے چڑھائی چڑھنے سے گھبرائے۔ اعجاز بٹالوی البتہ ہمیشہ چاق و چوبند ہوتے ہیں، اگر کسی پگوڈا پر چڑھنے کی نوبت آئی تو ہمیں دونوں نے جرأت کی۔ لیکن یہاں دیوارِ چین کی چڑھائی میں بازی ہمارے ہاتھ رہی۔ اعجاز دو بُرج پیچھے رُک گئے۔ جی تو اور آگے جانے کو چاہتا تھا لیکن ساتھیوں کے ساتھ واپس بھی تو پہنچنا تھا۔ ان آخری دو بُرجوں کے درمیان چڑھائی اتنی سیدھی ہے کہ ستّر پچھتّر درجے کا زاویہ بنتا ہو گا۔ اُترنے میں گرنے کا اندیشہ زیادہ تھا، جوتا پتھروں پر سے رپٹ رپٹ جاتا تھا اس لیے ہم نے نعلیں کو در بغلین کیا یعنی اپنے جوتے اُتار کر ہاتھ میں لے لیے جس نے دیکھا تماشا سمجھا اور بچوں نے تو تالیاں بھی بجائیں۔

نیچے اس کے چھوٹا سا چائے خانہ ہے۔ وہاں چائے پی گئی اور پھر دیوارِ عظیم کے سائے میں تصویر کھنچوائی گئی۔ یہ دیوار جبری مزدوری سے بنی تھی۔ ہماری کتاب 'چینی نظمیں' میں ایک نوحہ ہے۔ ایک بی بی مینگ چیانگ نو کے میاں کو زبردستی بیگار میں پکڑ کر لے گئے تھے۔ پھر کیا ہوا معلوم نہیں۔ غالباً ہزاروں دوسرے مزدوروں کی

طرح وہیں مشقت کرتا ہوا مر کھپ گیا۔ یہ نوحہ بارہ ماسہ کی صورت میں ہے۔ نئے سال یعنی جنوری سے شروع ہوتا ہے۔



صاحب نور اللّغات کے نزدیک دیوارِ چین ہی دیوارِ قہقہہ ہے

لو نیا سال آیا بہاریں لیے
آج آلوچے پھولوں سے بھر پور ہیں
آج ہر گھر کے در پر ہیں روشن دیئے
لوگ خوش بخت ہیں، لوگ مسرور ہیں

ہر طرف، ہر جگہ تازگی چھا گئی جنوری آ گئی
آج پورا ہے بستی کا ہر خاندان
ایک میرا ہی دل زار و مہجور ہے
دانؔ کو لے گئے ہیں وہ بے گار میں
اب وہ دیوار عظیم کا مزدور ہے
میرے دل کو یہاں بے کلی کھا گئی
جنوری آ گئی۔

فروری آئی ہے
اور دامن میں لائی ہے خوبانیاں
چڑیاں آنے لگیں
اور دکھن کی جانب کی دیوار پر
ایک اک کر کے ڈیرے جمانے لگیں
گھونسلوں کو سجا کر دلہن کی طرح
ان کے جوڑے تو گلگشت کرنے لگے
بڑھ گئیں میرے دل ہی کی ویرانیاں

فروری آئی ہے

مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی سب کی اپنی اپنی کیفیت ہے۔ پنجابی، سندھی، دکنی سب میں بارہ ماسے موجود ہیں۔ اردو میں بیس پچیس برس پہلے سلام مچھلی شہری نے ایک بارہ ماسہ لکھا تھا جسے اردو ادب میں اعلیٰ مقام ملنا چاہیے۔ خیر ہمارے چینی بارہ ماسہ میں سے اب ایک اگست کی سنیے:

ماہِ اگست میں گُل بدست آ گیا
تیج پات آ کے گلشن کو مہکا گیا
ہنس آنے لگے
چھٹیاں خوش نصیبوں کی لانے لگے
اور بے فکرے گاؤں کے چوپال میں
سارا دن بیٹھ کر گپ اُڑانے لگے
یہ مہینہ بھی یونہی گزر جائے گا
اس کی پوشاک کوئی نہ پہنچائے گا۔
آخر نومبر میں وہ خود فیصلہ کرتی ہے۔

ردی بھر پور ہے۔
برف کے گالے پھر چار سو چھا گئے
یعنی پھر سے نومبر کے دن آ گئے
آپ ہی جاؤں گی
وانؔ کو اس کی پوشاک پہنچاؤں گی
جنگلوں اور پہاڑوں کے کوّے مجھے
راہ بتلائیں گے
اور میں روتی ہوئی
زیرِ دیوارِ عظیم پہنچ جاؤں گی۔

عجیب حسرت آمیز نوحہ ہے۔ خصوصاً ایک جگہ جہاں وہ کہتی ہے :

میرے پیتم مرے وانؔ کو چھوڑ دو
ظالمو چھوڑ دو

زیر دیوارِ عظیم بیٹھے اپنے ہی دوستوں سے ہم نے ذکر کیا۔ سب نے اسے سن رکھا تھا۔ شمالی چین کے ایک ادب کی یہ مشہور چیز ہے۔

مسافر کو پرانی تہذیبوں اور گزرے زمانوں کے آثار ہر جگہ ہر ملک میں نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ دل کو فوراً گداز کرتے ہیں۔ ہم پر جو اثر شیراز میں مزار سعدی کی زیارت پر ہوا ویسی کیفیت تو پھر یا اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی۔ لیکن دیوارِ عظیم نے کہ جس کا احوال دنیا کے سات عجوبوں کے ضمن میں ہم نے بہت صغر سنی میں پڑھا تھا ایک عجیب اثر جی پر چھوڑا۔ یا پھر دل گداختگی کی یہ کیفیت کینٹن میں رسول اللہؐ کے صحابی ابی وقاصؓ کے مقبرے اور نواحی قبرستان کے گل بوٹوں کو دیکھ کر طاری ہوئی۔

تو صاحبو! اب واپسی، لیکن راستے میں منگ بادشاہوں کے زیرِ زمین مقابر بھی دیکھتے چلو۔ یہ مقبرے کہ زمین کی سطح سے چالیس پچاس گز نیچے ہوں گے۔ غالباً اس لیے زیر زمین بنائے گئے کہ بعد کے آنے والوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہیں۔ منگ وہ چینی خاندان تھا جس نے چنگیز خان کے وارثوں سے سلطنت چھینی اور عہد اس کا ۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء تک ہے۔ یوں کہیے کہ مقبروں والے یہ بادشاہ اکبر اعظم کے ہم زمانہ تھے۔ صدیوں یہ مقبرے دنیا کی نظروں سے پنہاں رہے۔ یہ غالباً پچھلی صدی کی بات ہے کہ تجسس کرنے والوں کو ایک لوح ملی جس میں ان کے راستے کی سمت مرموز تھی۔ برسوں کی کھدائی کے بعد ایک دروازہ تیغہ کیا ملا۔ اندر اُترے تو

بند ایوانوں میں مقبروں کے علاوہ بڑے بڑے چینی کے ظروف میں انواع واقسام کی نعمتیں موجود پائیں۔ سونے چاندی اور جواہر کے ڈھیر لگے تھے۔ چوبی تابوت تو سیلن اور موسمی اثرات سے خستہ و خراب ہو کر مٹی ہو چلے تھے اور بعد میں دوبارہ انہی نقشوں پر بنوائے گئے لیکن باقی چیز سلامت تھیں۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد دروازوں کو کھولنا آسان نہ تھا۔ جن لوگوں نے دروازے بند کئے انہوں نے اندر کی بلّیاں گرا کر ایسا انتظام کیا تھا کہ کوئی باہر سے نہ کھول سکے۔ لیکن دانشمندوں نے یہ گرہ بھی کھول ہی لی۔ عجیب آسیبی ماحول ہے۔ اوپر ستّر اسّی فٹ اونچی چھت ہے، نیچے غلام گردشیں اور طاقچے۔ ایک بڑے ظرف میں قربان گاہ کی بتیوں کے لیے تیل بھرا تھا، اب بھی موجود ہے لیکن بہت گاڑھا ہو گیا ہے۔ اتنے میں ہمارے چینی دوستوں نے کہا ایک چیز اور رہ گئی ہے۔ اِدھر آؤ۔

ایک بہت بوسیدہ چار پانچ سو برس پہلے کا چوبی دروازہ جھک کر پار کیا تو اندر پہنچ کر سب آنکھیں جھپکنے لگے۔ تو کیا منگ زمانے میں ہماری طرح کے صوفے، کرسیاں اور میز بھی ہوتے تھے۔ میزبان مسکرائے۔ اس دور کے اس بغلی کمرے کو مہمانوں کی نشست کے لیے درست کر لیا گیا تھا۔ فقط دروازہ عہدِ قدیم کا باقی رکھا تھا۔ سب بیٹھے، چائے آئی، اور سب اپنی حیرانی پر ہنسے۔

معلوم ہوا کہ ابھی ایک دو مقبرے کھولے گئے ہیں۔ نشاندہی سترہ اٹھارہ کی ہو چکی ہے، جو ان نواحات میں میلوں تک نصف دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں۔

باہر آئے تو میزبانوں نے سب کو ٹھنڈا پلوایا۔ ٹھنڈا سے یہاں مطلب اورنج ہی لیجئے۔ سٹّر کروڑ کا یہ ملک کوکا کولا، پیپسی کولا، سیون اپ، کناڈا ڈرائی اور فانٹا، دورِ جدید کے ان تمام لذایذ کو جانتا بھی نہیں۔ ان کے بغیر ہی ترقّی کر رہا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ کیسے کر رہا ہے۔ جب یہ بیرونی نعمتیں اس کے دروازے، ہانگ کانگ اور پڑوسی جاپان میں موجود ہیں تو اپنے ہی سنگترے نچوڑنے پر اتنا اصرار کیوں؟

کھانے کی باتیں پھر کبھی سہی اب ذرا پینے کی بات سن لیجئے۔ عام آدمی کا مشروب گرم پانی ہے۔ آج سے نہیں صدیوں سے۔ یا تو گھر میں پتیلا چڑھا رہے گا ورنہ بازار میں دیگ اُبل رہی ہے۔ وہاں سے دو پیسے میں بالٹی بھروا لائیے۔ طالب علم اسکول جاتا ہے یا باہر تفریح کو تو اس کے بستے کے ساتھ ایک مگ لٹکا رہتا ہے۔ اس سے زیادہ عیاشی مطلوب ہے تو چند پتیاں چائے کی ڈال لیجئے اور چسکی لیتے رہیے۔ جہاں گئے اسی مشروب سے خاطر ہوئی۔

وزیر خارجہ چن ژی نے بھی اسی سے تواضع کی اور فیکٹری مزدوروں نے بھی۔ بازار

میں یہ چیز ایک پیسے کی ہے، گھر میں تو مفت ہی سمجھئے، اسی ایک مد میں دیکھا جائے تو ہم جو شکر اور دودھ کا جوشاندہ پیتے ہیں اس کے مقابلے میں چینی لوگ سال بھر میں کروڑوں روپے بچاتے ہوں گے۔ ہم کالی چائے کے رسیا لوگوں کے لیے البتہ ہوٹلوں میں انتظام ہے۔ آپ بلیک ٹی مع دودھ اور شکر مانگئے۔ چینی میں اسے خونچا کہتے ہیں۔ اس ایک لفظ میں ملباری ہوٹل کی چائے کا مزہ، مٹھاس اور گاڑھاپن بھی آ جاتے ہیں۔

ریل میں ہر نشست کے ساتھ چائے کے گلاس رکھنے کی جگہ ہے۔ اکثر سینماؤں اور تھیٹروں میں کرسی کے دہنے ہتھے کے اندر گلاس رکھنے کے لیے سوراخ بنا ہے۔ کام کرتے جایئے اور ایک ایک گھونٹ چُسکتے رہئے۔ تھوڑی دیر میں کوئی آئے گا اور اس میں مزید گرم پانی ڈال جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اس سے معدے کا نظام درست رہتا ہے۔ جراثیم کا دفعیہ بھی ہو جاتا ہے۔ کم خرچ بلکہ بے خرچ بالا نشیں۔ ہم نے بھی کچھ دن گرم پانی پیا۔ پھر چھوڑ دیا۔ کس برتے پر تتا پانی۔

کھانے سے پہلے اور بعد۔ بلکہ آپ یوں بھی باہر سے آئیں تو آپ کو گرم پانی میں بھیگا ایک تولیا یا رومال پیش کیا جائے گا۔ اس سے منہ ہاتھ پونچھئے اور ترو تازہ ہو جایئے۔ یہ رواج ہم لوگوں کو بہت اچھا لگا۔ واقعی خستگی اور ماندگی اس سے دور ہو جاتی تھی۔

ہمارے پیر سائیں حسام الدّین راشدی صاحب نے تو کچھ تولیے وہاں سے خریدے بھی کہ وطنِ عزیز جا کر میں بھی یہی کیا کروں گا، لیکن وطن عزیز آکر تو اور بھی بہت کچھ کرنے کا عزم ہمارے سارے ساتھیوں نے کیا تھا۔ کسی سے ایسے آثار ابھی ظاہر نہیں ہوئے۔ شاید کان نمک میں آکر پھر سب نمک ہو گئے۔ پیر صاحب تولیے استعمال کرنے کی حد تک ثابت قدم رہے ہوں تو شاید رہے ہوں۔



ایک دن اردو کے طالب علموں کے ساتھ



چین والے ہماری چینی زبان کی مہارت پر حیران رہ جاتے

جب ہم چین گئے ہیں تو چینی زبان سے بالکل کورے تھے لیکن ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ سترہ اٹھارہ دن بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ دو لفظ نہایت روانی سے بولنے لگے۔ ایک نی ہاؤ (یعنی مزاج شریف) دوسرا چائی چن (یعنی اچھا پھر ملیں گے) سو مہمان کو یہی دو لفظ آنے چاہیں باقی گفتگو کے لیے ترجمان موجود ہے۔ ہاں یاد آیا۔ ایک اور لفظ بھی ہم برجستہ اور باموقع بول کر چینیوں کو حیران کرتے تھے۔ وہ ہے شے شے (یعنی شکریہ) بعضوں نے پوچھا بھی کہ آپ نے اتنی جلدی اتنی چینی زبان کیسے سیکھ لی۔

چند دن بعد ہم جاپان گئے تو جاپانی زبان میں بھی اسی طرح مہارت حاصل کرنے کا عزم کیا کیونکہ ہم کو لسانیات سے ہمیشہ شغف رہا ہے۔ افسوس کہ وہاں ہمارا قیام مختصر تھا یعنی کل آٹھ دن۔ اس کے باوجود ہم اپنی زبان میں شکریہ ادا کرنے پر قادر ہو گئے یعنی ”آری گاتو گزائی مش“ کا لفظ اہلِ زبان کی طرح بولتے تھے۔ اگر کچھ فرق تلفّظ میں تھا بھی تو تھوڑا سا جھک کر سینے پر ہاتھ رکھنے سے سُننے والا جان لیتا تھا کہ ہم اظہارِ ممنونیت کر رہے ہیں۔ ایسے بھی اعتراض کرنے والے موجود ہیں جنھوں نے کہا کہ واہ ایک ہفتے میں ایک لفظ جان لینا کیا کمال ہے۔ ہمارے قارئین انصاف

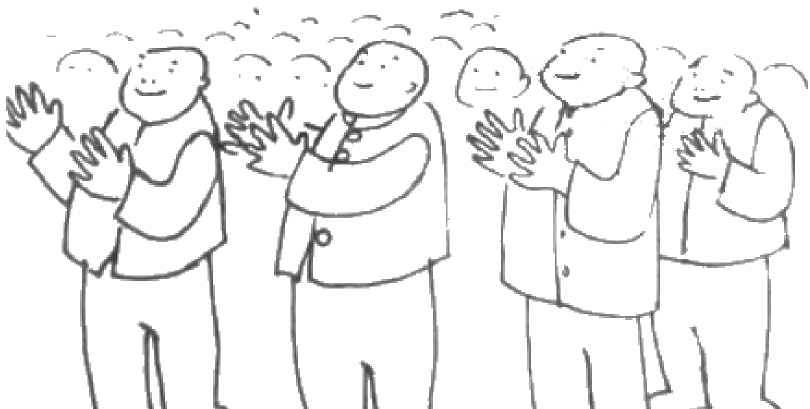
سے کہیں ان میں سے کتنوں کو معلوم تھا آری گاتو گزائی مش کا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم چند ماہ اور وہاں رہتے تو انہی کی زبان میں صاحب سلام کرنے لگتے۔

ہاں تو چین میں ایسا بھی ہوا کہ ترجمان پاس نہ تھا پھر بھی ہم کو چینیوں سے مکالمت میں کبھی دقّت نہ ہوئی۔ ہم نی ہاؤ کہتے تھے اُدھر سے چینی زبان میں کچھ ارشاد ہوتا تھا۔ ہم شے شے شے کرتے جاتے حتیٰ کہ اس کی بات ختم ہو جاتی اور ہم چائی چن، چائی چن کر کے رُخصت ہو جاتے۔

ممکن ہے ہم چینی زبان میں مزید لیاقت بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے بلکہ اب یاد آتا ہے کہ ہم گرم پانی بھی چینی زبان ہی میں طلب کرتے تھے اور ”کے سوائے“ کہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر عالیہ امام کی مثال کو دیکھ کر ہم نے تحصیل السنہ کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ وہاں کئی ماہ سے ہیں، پیکنگ ریڈیو پر کام کرتی ہیں۔ ایک روز تشریف لائیں تو ہم نے کہا آپ کے لیے چائے کا بندوبست کریں؟ فرمایا کرو۔ ہم نے کہا شکل یہ ہے کہ ہم اردو میں کر سکتے ہیں، حد سے حد انگریزی میں۔ بیرا ہم بلائے دیتے ہیں، گفتگو آپ کیجئے گا۔

بیرا آیا۔ بیگم عالیہ امام نے اپنے لکھنوی لہجے میں بہت کچھ کہا۔ اتنا یاد ہے کہ چ کے

مرکبات تھے۔ بیرا کھڑا سر ہلاتا رہا اور ہم نے از راہِ تحسین عالیہ امام صاحبہ کو دیکھا بلکہ کہا بھی کہ آپ نے ایسی قابلِ رشک مہارت کیسے پیدا کی۔ انہوں نے بتایا کہ آدمی ذہین ہو تو چینی زبان مشکل نہیں۔ چونکہ ہم یہ شرط پوری کر سکتے تھے لہٰذا کچھ دل گیر اور مایوس ہو گئے۔ لیکن اتنے میں بیرا آ گیا۔ دیکھا کہ دو قدِّ آدم گلاس دودھ کے ہیں۔ بیگم عالیہ بیرے پر بہت خفا ہوئیں کہ تم اتنی چینی زبان بھی نہیں سمجھتے کہ میں کہوں چائے تو چائے لے آؤ۔ لیکن وہ بس کھڑا ہاتھ ملتا رہا۔ دل میں ضرور شرمندہ ہوا ہو گا۔



اردو کے مشہور ادیب خاطر غزنوی بھی وہاں ہیں اور زیادہ دِنوں سے ہیں۔ ان کا کام

ہی تحصیلِ زبان ہے تاکہ واپس آکر یہاں چینی زبان سکھا سکیں۔ ہم نے دیکھا کہ وہ ٹیکسی والے کو سمجھا لیتے ہیں کہ کدھر چلنا ہے۔ بولے دو ڈھائی سو لفظ سیکھ گیا ہوں۔ پانچ ہزار فقط سیکھ کر اخبار پڑھا جا سکتا ہے۔ ہم نے کہا کتنے دن لگیں گے۔ بولے بشرطِ حیات چند برس اور۔ ہم نے کہا۔ خیر یہ رہا اخبار کچھ تو پڑھو۔ کافی دیر کوشش کے بعد انہوں نے کئی لفظوں پر انگلی رکھی کہ یہ آتے ہیں فی الحال، خیر قطرہ قطرہ بہم شود دریا۔



تالی بجاتے بجاتے یہ حال ہو جاتا تھا

پھر ایک روز ہم نے سوچا کہ دیکھیں چینی لوگ اردو سیکھتے ہیں تو کیسی سیکھتے ہیں۔ اگر

چینیوں کو اپنی زبان کے مشکل اور پیچیدہ ہونے پر ناز ہے تو ہم کو بھی ہے۔ خیر ایک روز بندوبست ہوا اور ہم لوگ پیکنگ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جا نکلے۔

پہلے تو ایک بیٹھک میں وائس چانسلر صاحب نے ہمیں شرف ملاقات بخشا۔ پھر تعارف کراتے کراتے کہا۔ یہ ہیں مادام شان یون، یہاں اردو پڑھاتی ہیں۔ ہم نے کہا آیئے بیگم صاحبہ ہمارے پاس آ جایئے۔ وہ مُسکراتی ہوئی اٹھ کر آ گئیں اور بولیں ”آپ ابنِ انشا صاحب ہیں نا۔ آپ کی نظمیں ہم نے پڑھی ہیں۔ افکار ہمارے پاس آتا ہے اور آپ کی کتاب ہماری لائبریری میں ہے۔“

چائے وائے پینے کے بعد ہم نے وہ کتابیں نذر کیں جو ہم یہاں سے لے گئے تھے۔ اور مادام شان یون نے کہا۔ ”آیئے اب آپ کو طالب علموں سے ملائیں۔“

پیکنگ یونیورسٹی ایک وسیع و عریض رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ راستے میں مختلف شعبوں کی عمارتیں تھیں۔ ہر جگہ طالب علموں کے ٹھٹ تھے جو ہمیں دیکھ کر دو رویہ کھڑے ہو جاتے اور تالیوں سے استقبال کرتے۔ رسم یہ ہے کہ مہمان بھی جواباً تالی بجاتا ہے۔ چین کے قیام کے دنوں میں ہم کو ہر روز اتنی تالیاں بجانی پڑتی تھیں کہ رات کو آکر ہاتھ آگ پر سینکتے تھے اور وِکس کی مالش کرتے تھے۔



شعبہ اُردُو کے طالب علم ہمارے خیر مقدم کے لیے پہلے سے کھڑے تھے۔ ان میں سے آدھے لڑکے تھے، آدھی لڑکیاں۔ بڑے تپاک سے علیک سلیک ہوئی۔ بعضے فر فر بولتے تھے۔ بعضے اٹک اٹک کر۔ ہم نے کہا چلئے کلاس دیکھیں لیکن طالب علم مصر تھے کہ پہلے ہم ان کی قیام گاہیں دیکھیں۔ وہاں دکھانے کی کوئی ایسی بات نہ تھی۔ بہت چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اور ہر ایک میں ایک دو منزلہ چارپائی۔ ایک کونے میں ایک میز اور کتابوں کے لیے ایک الماری۔ ایک طالب علم نیچے کی چارپائی پر سوتا تھا۔ دوسرا اُوپر ٹنگتا تھا۔ ویسے نرم گدّے اور اُجلی چادریں تھیں۔ ہم لوگ قریب قریب سب کے سب دو کمروں میں تقسیم ہو گئے۔ وہاں اتنی کرسیاں کہاں

تھیں۔ بس چارپائیوں پر اور میز پر چڑھ بیٹھے۔ باقی باتیں تو فروعات تھیں۔ اردو کی محبت اصل شوق چیز تھی۔

اکثر لڑکے لڑکیاں فر فر بولتے تھے اور سب سے تعجّب کی بات یہ تھی کہ کسی سے تذکیر و تانیث کی کوئی غلطی نہ سنی۔ جیسی اندرون پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگوں سے ضرور ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خط پختہ تھے۔ بعضوں کے منشیانہ اور املا میں کوئی غلطی ہجےّ کی نہ تھی۔ ہم نے کہا پڑھتے کیا ہیں آپ لوگ۔ معلوم ہوا اچھی خاصی لائبریری اردو کتابوں کی ہے اور پھر اخبار "جنگ" آتا ہے۔ اس میں سے مضامین، اداریے یا خبریں لے کر سائیکلو اسٹائل کرالی جاتی ہیں اور طالب علموں میں بانٹ دی جاتی ہیں۔ ہم نے دیکھا تو پہلا ہی سبق صدر ایوب کے دورۂ چین پر تھا۔

لائبریری میں گئے تو واقعی نئے ادب کی بہت سی اچھی کتابیں موجود تھیں اور طالب علم ہمارے بعض ہم عصروں کا ذکر ان کی کہانیوں کے حوالے سے کرتے تھے۔ مادام ہے کہا میں آپ کی نظم شنگھائی کا ترجمہ چینی میں کر رہی ہوں۔

ہمارے وفد کے رکن جو اُردُو کے آدمی تھے ان کی سرشاری کا بیان کرنا مشکل ہے۔

اتنی دور ایک مختلف تہذیب کے ملک میں اُردُو کے پودے کو پھولتے پھلتے دیکھنا واقعی ایک جذباتی تجربہ تھا۔ ہم نے مادام سے کہا کہ ان طالب علموں کو ہم چائے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان سب کو لائیے وہاں اور باتیں ہوں گی۔ ہم ان کو اور کتابیں دیں گے۔ اردو پاکستان جاکر کتابوں کی لین ڈوری باندھ دیں گے۔ یاد رہے کہ ایسے وعدے وفا نہیں ہوا کرتے۔

طالب علم تو پھر آئے اور ہمارے ساتھ چائے پی۔ ان کو کتابیں بھی ہم نے دیں، لیکن مادام کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکیں، تیس برس کی ہوں گی۔ بہت پسندیدہ اطوار کی اور سنجیدہ۔ ہم نے کہا کہ ہماری ڈائری میں اپنے دستخط دے دیجئے۔ انہوں نے یہ مہربانی کی کہ دستخطوں کے علاوہ ایک عبارت بھی لکھ دی۔ ان کا خط کم از کم ہمارے خط سے تو بہتر ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ طالب علموں نے اتنی مہارت فقط دو سال بلکہ کم میں حاصل کی تھی اور بیگم صاحبہ نے بھی اُردُو ایک چینی سے پڑھی ہے۔

آپ کی عمر کیا ہے؟

دیکھنے میں طالب علم لڑکے اور لڑکیاں دس بارہ چودہ سال تک کے لگتے تھے اور چونکہ انہیں اُردُو پڑھتے ابھی دوسرا سال تھا اس لیے ان کی استعداد کا اندازہ کر کے ہم نے ان کو بچوں کی کتابیں دیں۔ بلّو کا بستہ اور چاند تارا وغیرہ۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں جن کو ہم ازراہِ سرپرستی تھپکی رہے تھے۔ اتفاقاً ایک لڑکی سے ہم نے پوچھ لیا تمہاری عمر کیا ہے بٹیا؟ ایک لڑکا بول اُٹھا بیس سال کی ہیں یہ۔ لڑکی نے فوراً تردید کی اور کہا۔ ”یہ شرارت کرتا ہے جی، جھوٹ کہتا ہے۔“ ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ ہمارا پہلا اندازہ درست تھا۔ تاہم احتیاطاً ان بٹیا سے پوچھا۔۔ ”تو پھر کیا ہے تمہاری صحیح عمر؟“ بولیں اب کے جون میں بائیس برس کی ہو جاؤں گی۔“

ہم ذرا الگ ہو کر بیٹھ گئے اور بلّو کا بستہ واپس لے کر ان کو موازنہ انیس و دبیر وغیرہ دیں۔

اس سلسلے میں ایک عجیب حادثہ ہم پر ووہان میں گذرا۔ وہ یوں کہ ہم ایک ڈراما دیکھنے گئے۔ کیا بات ہے ڈرامے کی۔ بہت عمدہ تھا لیکن اس کا مرکزی کردار ایک نرم و نازک استانی تھی۔ آواز چاندی کے گھنگھرو اور ہاتھ باہیں کومل کچنار۔ ہم اُردُو کے شاعر ٹھہرے دلوں کی پوٹلی ہمارے ساتھ ہی تھی۔ ایک دل ادھر میں پھینکا۔ عمر اس چنچل کی اٹھارہ بیس ہو گی۔ چونکہ میک اپ بھی ہوتا ہے لہٰذا چوبیس پچیس جانئے۔ اس سے زیادہ رعایت دینی مشکل ہے۔ ہم نے دوستوں سے کہا یارو دو روز اور ووہان میں ٹھہرو تو اس پر ایک مثنوی سحر البیان کے ٹکّر کی ہم لکھ جائیں۔ دوستوں نے ہمارا اشتیاق دیکھ کر اس عفیفہ کو بُلا بھیجا اور اس سے ہمارا تعارف کرا دیا۔ ہم نے تعریف کی کہ اے ناظورۂ دلفریب، تیرے انگ انگ میں جادو ہے، تو یُوں ہے اور تُو ووں ہے۔ ڈرامے میں تو نے کمال کر دیا۔

بولی۔ من آنم کہ می دانم۔ اتنے دن سے سٹیج پر کام کر رہی ہوں اتنا بھی نہ کروں؟

ہم نے کہا اے لعبتِ چین کب تو نے دِلوں کو برمانے کا یہ شغل اختیار کیا تھا۔ تھوڑا

رُکی۔ حساب لگا کر بولی۔ چالیس برس سے۔ بہت چھوٹی عمر میں سٹیج پر آنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت عمر اس بندی کی اڑ تالیس برس دو مہینے ہے۔

ہمارا علم تو خیر سب جانتے ہیں سطحی ہے۔ تھوڑا بہت شاعری افسانہ ادب تاریخ پڑھ رکھا ہے۔ ریسرچ سے کبھی رغبت نہ رہی۔ مخطوطات وغیرہ کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے سوائے ایک مخطوطہ کے کسی کا بنظرِ غائر مطالعہ نہیں کیا اور وہ ہے ہمارا غیر مطبوعہ دیوان۔ لیکن ہمارے ساتھ ڈاکٹر وحید قریشی بھی تھے جو تحقیق کے مرد میدان ہیں اور کسی کتاب کو ہاتھ نہیں لگاتے تا آنکہ اس کو دیمک نہ چاٹ گئی ہو۔ شعبۂ اردو لائبریری میں ہم نے اُردُو ادب کی بہت سی کتابیں دیکھیں اور خوش ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب سے بھی کہا کہ آپ بھی خوش ہو جایئے۔ اقبال، جوش، سرشار، شرر اور غالب سب موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کوئی مخطوطے بھی ہیں آپ کے پاس۔ یہ لفظ چینی طالب علموں کے لیے شاید نیا تھا۔ اس لیے ہم نے سمجھایا کہ وہ کتابیں جن کو پبلشر نہ ملیں آخر میں مخطوطہ کہلاتی ہیں۔ ہمارے چینی میزبانوں نے بہت معذرت کی کہ نہیں ہمارے پاس حاتمؔ اور قایمؔ اور ولیؔ اور لچھمی نرائن شفیقؔ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی تحریر نہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بے تعلق ہو کر بیٹھ گئے کہ یہ مبتذل مطبوعہ کتابیں تم دیکھو۔ میرے کام کی نہیں۔

اعجاز بٹالوی نے دعویٰ کیا کہ اردو زبان چین میں عام سمجھی جاتی ہے بلکہ پنجابی بھی۔ اس کا انہوں نے ثبوت بھی دیا، وہ یوں کہ کھانے کا آرڈر بیرے کو اردو یا پنجابی میں دیتے تھے۔ فقط۔۔۔ ضرورتاً کوئی لفظ اس میں انگریزی کا آجاتا تھا۔ جیسے ہم اپنی روزمرہ گفتگو میں کرتے ہیں۔ مثلاً وہ بیرے سے کہتے۔۔۔۔ بریک فاسٹ لاؤ جس میں دو ہاف بوائلڈ ایگ ہوں، بٹر ہو، ٹوسٹ ہو اور چائے کے ساتھ مِلک اور شوگر بھی۔ آپ یقین نہیں مانیں گے بیرا فوراًیہ چیزیں لے آتا تھا۔ کبھی غلطی نہ کرتا تھا۔ خود ہم نے بھی تجربہ کیا۔ بیرے سے کہا سگریٹ لاؤ، ماچس بھی لاؤ۔ اور وہ دونوں چیزیں لے آیا۔ ایک بار ہم نے خالص جلندھری لہجے میں پنجابی بھی بول دیکھی کہ میاں بیرے ٹی لیاتے شوگر بھی لیاتے مِلک بھی لیا۔ اس نے چائے دودھ شکر سب حاضر کر دیے۔ پیر حسام الدّین راشدی صاحب نے ایک روز کھانے کی میز پر سندھی بولی۔ اس کے سمجھنے میں بھی بیروں کو کوئی دقّت نہ ہوئی۔ انہوں نے اورنج مانگا اور واقعی تھوڑی دیر میں سائیں بیرا سنگترے کے رس کا ایک گلاس لے آیا۔ ہم سب نے حیرت کی۔

چینیوں کی مہمان نوازی مشہور ہے۔ ایک روز ہم ایک چینی فلم دیکھ رہے تھے۔ بڑے معرکے کی تھی۔ نہایت ڈرامائی منظر تھا کہ ہمارے ایک معمّر ساتھی نے ہم کو

ٹہوکا دے کر کچھ کہا ہم نے سمجھا فلم کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہمہ تن متوجہ ہوئے۔ انہوں نے کہا مونگ پھلی کھانے کو جی چاہتا ہے۔ وہاں وطن میں بھی جب تک مونگ پھلی سے جیب نہ بھری ہو میں فلم نے نہیں دیکھتا۔ ہم نے پہلے ٹالنا چاہا۔ آخر ترجمان تک ان کی سفارش پہنچادی۔ کچھ وقت ترجمان کو یہ سمجھانے میں بھی لگا کہ مونگ پھلی کیا ہوتی ہے اور اس کی اس وقت اشد ضرورت کیوں پڑ گئی ہے۔ وہ کوئی آدھے گھنٹے میں واپس آیا۔ ہم نے پوچھا دیر کیوں لگی۔ اس نے بتایا کہ یہاں تو یہ دستور نہیں لوگ بالعموم مونگ پھلی کے بغیر ہی فلم دیکھ لیتے ہیں۔ میں ٹیکسی لے کر خشک پھلوں والے بازار گیا تھا وہاں سے مونگ پھلی لی۔ پھر ایک جگہ بھٹی پر لے جا کر اُسے بھنوایا اور یہ لیجئے۔

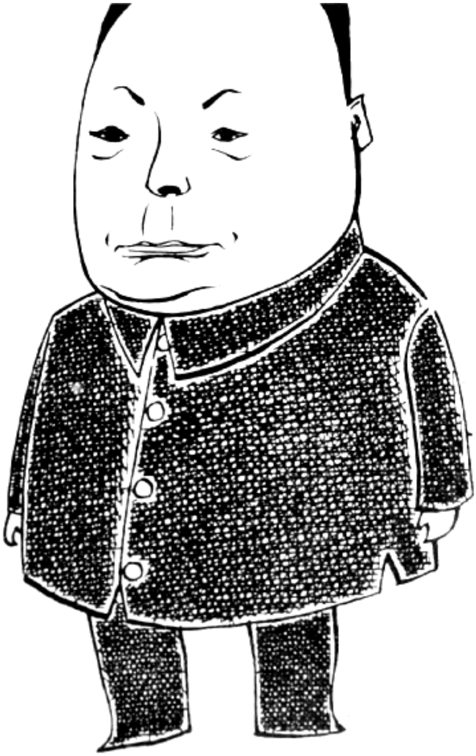
چین کے سفر میں ہمارے اکثر ساتھی جو فقط۔۔۔ روز ابر و شب ماہتاب میں سگریٹ پیتے تھے یکا یک چین سموکر ہو گئے۔ سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے تھے۔ دیا سالی جلانے کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ ان میں سے ایک آدھ بزرگ سے ہم نے کہا بھی کر تھوڑا پرہیز کریں آپ کو کھانسی ہو رہی ہے۔ بولے کھانسی ہو رہی ہے تو کیا ہے؟ یہاں ڈاکٹری علاج بھی تو مفت ہے۔ یہ کہ کر پھر ایک کش لگایا اور کھانسے۔ کھانے کی میز پر کوئی چیز آ جائے اسے واپس کرنا ہمارے بعض ساتھی آداب کے خلاف

جانتے تھے۔ اگر ناشتے میں ٹوسٹ پر لگانے کے بعد مکھن بچ رہا ہے تو اسے چائے میں ڈال لیتے تھے کہ مقوّی صحت ہے۔ ایک صاحب کو تو ہم نے چائے میں دہی ڈالتے بھی دیکھا۔ رات کو دودھ پینا اکثر معمول تھا اور ایک صاحب تو تہجد کے وقت بھی اُٹھ کر کھاتے تھے بلکہ کھانے کے لیے اُٹھتے تھے۔ ہمارے کوی جسیم الدّین بہت دلچسپ شخصیت ہیں۔ یورپ اور امریکہ سب جگہ گھوم آئے ہیں اور بغیر بالوں میں کنگھا کیئے اور کوٹ پتلون کے پورے بٹن لگائے بعض اوقات ترجمان سے ایسا سوال پوچھتے تھے کہ اسے جواب دیئے نہ بن پڑتی۔ بغلیں جھانکتا رہ جاتا تھا۔ گائیڈ آخر تک ان کا مطلب نہ سمجھا۔ حالانکہ کوی صاحب نے سیدھا سادا سوال کیا تھا کہ میاں Adulterated Food ملتا ہے؟ یعنی آٹے میں ریت، گھی میں موبل آئل، مرچوں میں برادہ اور ہلدی میں پسی اینٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ گائیڈ نے کہا۔ 'میں سمجھا نہیں۔' اب ہم نے آسان تر ہم معنی الفاظ استعمال کیے۔ Mix وغیرہ، لیکن وہ پھر بھی کچھ نہ بتا سکا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہاں یہ چیزیں ہوتی ہی نہیں۔ ایک اور بزرگ نے تو شنگھائی میں یہ بھی پوچھ لیا کہ یہاں امریکی سفارت خانہ کہاں ہے اور جب ہم وزیرِ خارجہ چن ژی سے ملنے جا رہے تھے تو دریافت کیا۔

"یہ چن ژی کون صاحب چیں؟"

ہم نے کہا۔ ”وزیرِ خارجہ ہیں۔“

”کہاں کے وزیرِ خارجہ؟“



مارشل چن ژی

”چین کے، پاکستان بھی آچکے ہیں۔“

اس پر انہوں نے کہا۔ ”میں اخبار نہیں پڑھا۔ اچھا کیا نام بتایا آپ نے ان کا؟ اچانگ پو؟“

ہم نے کہا۔ ”چن ژی۔ چن ژی۔ چن ژی۔“

لیکن جب ہم ان سے مل کر آ رہے تھے تب بھی انہوں نے یہی کہا کہ یہ چانگ پو صاحب یا جو بھی ان کا نام ہے آدمی اچھے ہیں۔ کس چیز کے وزیر ہیں یہ؟ پھر بتانا میں ڈائری میں لکھ لوں۔ “

ایک آدھ موقع پر ترجمانی کے فرائض اعجاز بٹالوی نے بھی سر انجام دیے۔ عالیہ امام نے ایک جلسہ بلایا۔ مقصود ان کا ہمیں سنکیانگ کے کباب کھلانا تھا۔ لیکن وہ اقبال اور نذر الاسلام کو بھی بیچ میں گھسیٹ لائیں کہ تم لوگ آئے ہو تو کچھ ان کے متعلق بھی بولو۔ کوی جسیم الدّین نے اس موقع پر بتایا کہ ان کے نذر الاسلام سے کیا کیا اختلافات رہے ہیں۔ بہت عمدہ تقریر تھی۔ اس کے بعد ایک صاحب نے اقبال کے متعلق خطبہ دیا۔ وہ انگریزی بول رہے تھے اور ترجمان کو چینی زبان میں ترجمہ کرنا تھا کیونکہ تین چار مہمان چینی بھی تھے۔ یہ صاحب بہت محبّ وطن سیاسی کارکن رہے ہیں اور انگریز دشمنی کے لیے مشہور۔ انگریز تو خیر اب نہیں رہے لیکن ان کی

یادگار انگریزی تو موجود ہے۔ اب وہ اپنی دشمنی اس سے نکالتے ہیں اور اس کی صرف ونحو محاورے روزمرے وغیرہ سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لیتے ہیں۔ لہٰذا چینی مترجم تو تھوڑی دیر میں ہارمان کے بیٹھ گیا۔ اس نے ایسی نیشلسٹ انگریزی کہاں سنی تھی۔ پھر موضوع بھی کچھ ایسا تھا۔ فرمایا، اقبال بہت پہلے چین کے متعلق کہہ گئے ہیں کہ چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا۔ یعنی چین پر بھی ہمارا مسلمانوں کا حق ہے اور عرب پر بھی اور ہندوستان پر تھی۔ اس پر اعجاز بٹالوی کسمسا کر اُٹھے اور کہا۔ میں وضاحت کرتا ہوں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ چین ہمارا پرانا دوست ہے اور ہمیشہ رہے گا اور وہ سامراجیوں کا منہ توڑ جواب دیں گے۔ اس پر سب نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ جناب مقرر نے اس کے بعد روحانیت، عرفانِ اقبال کے تصوّرِ جنون وغیرہ کے بارے میں فصاحت کے دریا بہائے۔ لیکن چینی مہمان سوکھے ہی اُٹھتے اگر اعجاز بٹالوی صاحب توضیح و تشریح نہ کرتے کہ روحانیت کا مطلب طبقاتی جدوجہد ہے اور جنون کا مطلب ہے سامراج کا مقابلہ اور مردِ مومن اور شاہین وغیرہ پرولتاریت کے سمبل ہیں۔ بہرحال جلسہ خوش اسلوبی سے ختم ہوا اور سب نے جناب مقرر کو مبارک باد دی۔

چن ژی صاحب خوب مزے کے آدمی ہیں۔ انہوں نے دروازے پر آکر استقبال

کیا۔ اور پھر بیٹھتے ہی ہمارے قائدِ وفد سے پوچھا جناب مولانا، کیا عمر ہو گی آپ کی؟ لیجئے یک سر سبھی کے چہروں کا تناؤرُخصت ہو گیا اور محفل میں شگفتگی آ گئی۔ پرنسپل ابراہیم خاں صاحب نے کہا، پچھتر برس کا ہوں۔ چن ژی بولے۔ اچھا تو آپ مجھ سے تیرہ برس بڑے ہیں۔ پھر ڈاکٹر انعام الحق سے خطاب کیا "آپ؟" انہوں نے بتایا کہ پینسٹھ برس، اب ہمارا نمبر تھا۔ مسکرا کر کہنے لگے، تم ان سے چھوٹے معلوم ہوتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ زیادہ چھوٹا نہیں۔ حد سے حد پینتیس چالیس برس کا فرق ہو گا۔ اس پر ہنسے۔ فرمایا ہم تو ایشیا کی روح کا اصل نمائندہ پاکستان کو جانتے ہیں۔ تبھی تو اس سے دوستی کی ہے۔ دوستی کا لفظ آیا ہے تو یہ جان لو کہ اس کے آداب ہم جانتے ہیں۔ آدھی رات کو بھی آواز دو تو حاضر ہیں۔

معلوم پڑتا ہے ڈپلومیسی یعنی بات کو گھُما پھرا کے کرنے اور بگلے کو اس کی آنکھوں پر موم رکھ کر پکڑنے کا فن چینی نہیں جانتے۔ آخر میں انہوں نے کہا تم ادیب لوگ مجاہد ہو۔ اپنے دل کی بات کہہ دیتے ہو۔ ہم وزیرِ خارجہ لوگ تو ڈپلومیٹ ہیں۔ کہتے کچھ ہیں، کرتے کچھ۔ ہم دل میں شرمندہ ہوئے کہ اپنے کو خود ہی بہتر جانتے ہیں بہر حال انکسار سے مسکرا کر رہ گئے۔

ہمارے قائدِ وفد نے کہا۔ آپ نے ڈپلومیٹوں کے متعلق صحیح فرمایا، یہ منافقت پیشہ

ہوتے ہیں۔ لیکن چن ژی صاحب! سب کے سب نہیں، بعضے وزیرِ خارجہ منافق نہیں بھی ہوتے۔ اس پر چن ژی صاحب نے قہقہہ لگایا اور کہا کدھر ہے فوٹو گرافر، میاں تصویریں لو ہماری، آیئے جی ایک گروپ فوٹو ہو جائے۔



حیدر قریشی، وقار عظیم، جسیم الدّین، پرنسپل ابراہیم خان، مارچل چن ژی، ابن انشا، ڈاکٹر انعام الحق، اعجاز بٹالوی۔
(پیچھے کی صف) چینی میزبان اور پیر حسام الدّین راشدی

آزادی کی سخت کمی ہے

چین میں چار ہفتے کے قیام کے بعد ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہاں آزادی کی سخت کمی ہے۔ ہمارے ایک ساتھی جو اپنے ساتھ پان لے کر گئے تھے بار بار فرماتے تھے کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں سڑکوں پر تھوک بھی نہیں سکتے۔ زیادہ دن یہاں رہنا پڑے تو زندگی حرام ہو جائے۔ ایک اور بزرگ نے فرمایا کہ یہاں کوئی دیوار ایسی نظر نہیں آئی جس پر لکھا ہو کہ "یہاں پیشاب کرنا منع ہے" جو اس امر کا بلیغ اشارہ ہوتا ہے کہ تشریف لایئے آپ کی حوائجِ ضروریہ اور غیر ضروریہ کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ ایک صاحب شاکی تھے کہ یہاں خریداری کا لطف نہیں دُکاندار بھاؤ تاؤ نہیں کرتے۔ ہر چیز کی قیمت لکھی ہے کم کرنے کو کہیئے تو مسکرا کر سر ہلا دیتے ہیں۔

ہوٹل کے بیروں کو بخشش لینے اور مسافروں کو بخشش دینے کی آزادی نہیں۔ بسوں اور کاروں کے اختیارات بھی بے حد محدود ہیں، آپ اپنی بس کو فٹ پاتھ پر نہیں چڑھا سکتے، نہ کسی مسافر کے اوپر سے گزار سکتے ہیں اور تو اور بجلی کے کھمبے سے ٹکرانے تک کی آزادی نہیں۔ اور بھی کئی آزادیاں جو آزاد دنیا کا خاصہ ہیں وہاں مفقود نظر آئیں۔ گداگری ممنوع، نائٹ کلب ممنوع، جوئے پر قدغن، کام نہ کرنا اور مفت کی روٹیاں توڑنا خارج از امکان، لڑائی دنگا، چاقوزنی، اغوا وغیرہ کی وارداتیں اور خبریں نہ ہونے کے باعث اخبارات سخت پھیکے سیٹھے۔ ملک کیا ہے، اچھا خاصا خوجہ جماعت خانہ ہے۔

ہمیں ذاتی طور پر ان آزادیوں کو برتنے کا شوق وہاں تو کیا ہوتا، یہاں بھی کبھی نہیں ہوا بس ایک دو بے ضرر سی رعائتیں معاشرے سے لے رکھی ہیں جنہیں وقتاً فوقتاً استعمال کر لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھول جانے اور اپنی چیزیں کھو بیٹھے یا چوری کرانے کی بھی ہے۔ عادت سے مجبور چین میں بھی ہم نے اس سے دریغ نہ کیا۔ پیکنگ سے چلتے وقت ہم اپنا ایک پاجامہ غسل خانے میں لٹکا چھوڑ گئے تھے۔ اس کی ہمیں ضرورت نہ تھی ہمارے پاس اور پاجامے بھی تھے لیکن بہر حال ہماری روایتی بھول سے ایسا ہوا۔ وہاں سے وہان پہنچ کر ابھی ہم دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ ہوٹل

والوں نے ایک پیکٹ دیا جس میں ہمارا پاجامہ دھلا دھلایا، استری شدہ اور ایک چپل پالش اور مرمت شدہ نفاست سے لپٹی ہوئی پائی گئی۔ پاجامہ ہمارا تھا اور چپل ہمارے دوست ڈاکٹر انعام الحق کی۔ وہ بولے ارے اسے تو میں خود ہی وہاں چھوڑ آیا تھا کہ کون اسے مرمّت کراتا پھرے۔ ووہاں میں ہم چند پرانے رسالے اور سن ہوا نیوز ایجنسی کے بلیٹن چھوڑ آئے تھے اس لیے کہ ہمارے کام کے نہ تھے۔ ان کا پیکٹ بھی کینٹن میں آملا۔ کینٹن سے ہانگ چو ریل میں آتے میں ہم نے ناخن کاٹنے کے لیے ایک پرانا بلیڈ استعمال کیا اور اسے وہیں میز پر پڑا چھوڑ آئے۔ دوسرے دن وہ ایک لفافے میں رکھا ہمیں ملا کہ ریلوے کا ایک ملازم دے گیا ہے۔ دیکھ لیجئے آپ ہی کا ہے۔



وفد کے لیڈر ابراہیم خان ایک روز ایک مڈل سکول دیکھنے گئے۔ وہاں ان کے فونٹین پن کا کلپ یا گر گیا یا یہ خود پھینک آئے تھے۔ وہ بھی دوسرے روز ہوٹل کے مینجر نے لا تھمایا کہ ایک سکول کے لڑکے آئے تھے اور یہ دے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شنگھائی سے چلتے وقت ہم کچھ چیزیں پھینک کے آنا چاہتے تھے جن میں ایک ہیئر آئل کی خالی شیشی تھی۔ ان چیزوں کو ہم نے ردّی کی ٹوکری میں ڈالا اور ہوٹل کے بیرے کو بُلا کر وضاحت کی کہ یہ چیزیں ہم خود چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ مزید اطمینان کے لیے ہوٹل کے مینجر کو سمجھانا پڑا کہ یہ سامان ہم نے بلا جبر و کراہ چین میں آپ کوئی چیز گم نہیں کر سکتے۔ اور برضا و رغبت پھینکا ہے۔ یہ احتیاط اس ڈر سے کی کہ کبھی ایسا نہ ہو یہ چیزیں دریافت ہوں اور ہوٹل والے ہوائی اڈّے کو فون کریں کہ ان لوگوں کا جہاز روک لیا جائے اور جب تک مسافر مذکور اپنی ہیر آئل کی شیشی وصول نہ کر لیں جہاز کو پاکستان جانے کی اجازت



نہ دی جائے۔

تعجب ہے ان پابندیوں میں چین کے لوگ کیسے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم نے تو اس وقت اطمینان کا سانس لیا جب ڈھاکے کے ہوائی اڈے پر ہمارا ہوائی سفر کا بیگ ہمارے دیکھتے دیکھتے ہماری نظروں سے غائب ہوا اور ہم سب نے مسافر خانے کی میزوں پر ایش ٹرے کے باوجود اپنے اپنے سگریٹ فرش پر پھینکے اور ہمارے دوست نے غسل خانے کی دیوار پر پان کی پچکاری ماری۔



چائے چُنتی لڑکیاں

چین میں عورتیں نہیں ہوتیں

ایک پاکستانی بزرگ چین تشریف لے گئے۔ کئی روز وہاں کوچہ و بازار میں گھومتے پھرے۔ واپسی سے ایک روز پہلے اپنے دوست سے پوچھا "کیوں جناب کیا چین میں عورتیں نہیں ہوتیں؟"

ان کے دوست نے کہا۔ "خیر باشد! آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ ذرا اپنے سوال کی معقولیت پر غور فرمایئے۔"

کہنے لگے۔ "بے شک یہ میں بھی جانتا ہوں کہ عورت کے بغیر محفلِ ہستی کی قدر نہیں ہو سکتی۔ فی الحال انسان ڈھالنے کی مشینیں اور کارخانے نہیں بنے لیکن اگر

عورتیں ہیں تو کہاں ہیں۔ کیا ان کو پردے میں رکھا جاتا ہے؟"

یہ واقعہ پیکنگ کے پاکستانی سفارت خانے میں ایک صاحب نے سنایا۔ ممکن ہے یہ داستان نہ ہو زیبِ داستان ہو، لیکن مقصود ان کے کہنے کا یہ تھا کہ چین میں عورتوں اور مردوں کے لباس میں کوئی فرق نہیں۔ وہی بند گلے کی جیکٹ، وہی پتلون، ایک سا جوتا، نہ سُرخی نہ لپ اسٹک، نہ بندے نہ جھومر، غرارہ نہ ساڑھی، نہ دوپٹہ نہ پرس، یہ سب سچ ہے۔ ہم خود جاتے ہوئے اپنی ہینڈی کرافٹ شاپ سے موتیوں کا ایک پرس لے گئے تھے۔ خیال یہ تھا کہ کوئی بیگم ادیبہ ملیں گی یا کسی ادیب کی بیگم کو نذر کریں گے تو خوش ہوں گی۔ لیکن وہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر آخر ایک پاکستانی خاتون کے حوالے کر آئے۔ وہاں تو کوئی خاتون سودا سلف لینے کو نکلے تو زیادہ سے زیادہ کپڑے کا تھیلا ساتھ ہوتا ہے اور بس۔

بایں ہمہ یہ بات مبالغہ ہے کہ عورت اور مرد کی پہچان نہیں ہو سکتی۔ حسن و رعنائی وہاں بہت ہے۔ ایسے ایسے چہرے نظر آئے کہ بس۔ اور پھر چہروں کا حسن صحت اور شادابی سے عبارت ہوتا ہے کہ کسی مصنوعی مدد کا محتاج نہیں۔



نئی نسل پرانی نسل کو پڑھا رہی ہے

ایک جگہ کچھ خواتین غازہ پوتے، بھڑکیلے لباس پہنے نظر آئیں۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ بے شک چینی ہیں لیکن سمندر پار کی چینی۔ سنگاپور سے سیر کے لیے یہاں آئی ہوئی ہیں۔ کسی شخص کو لاغر دیکھئے یا کسی کا پیٹ بڑھا ہو پایئے تو یہ بھید کھلے گا کہ یہاں کے متوطن نہیں۔ باہر سے آیا ہوا ہے۔ سارے چین میں کسی مرد یا عورت کو لاغر نہ پایا۔ ہسپتالوں میں بہت کم مریض ہوتے ہیں۔ وارڈ کے وارڈ خالی پڑے رہتے ہیں، کوئی بیمار ہو تو آئے۔

عورتیں دوسرے بہت سے ملکوں میں بھی کام کرتی ہیں لیکن چین کی طرح نہیں۔ کام کرنے میں عورت اور مرد کا کوئی فرق نہیں۔ عورتیں بھاری مشینیں چلاتی ہیں۔ کاریں اور ٹرک چلاتیں ہیں۔ دکانیں اور کارخانے چلاتی ہیں کھیتوں میں ہل چلاتی ہیں۔ سڑکیں بناتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ بڑے بڑے بوجھ اُٹھاتی اور کھینچتی ہیں۔



چین کی ایک بات جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی یہ بھی ہے کہ ایک مرد یا عورت اتنا بوجھ کیسے کھینچ لیتے ہیں جس کے لیے ہمارے ہاں گھوڑے کی ضرورت ہو۔ ایک

ریڑھا لو ہے کی سلاخوں یا سرخ اینٹوں یا اناج کی بوریوں سے لدا ہوا ہے اور ایک شخص بڑے آرام سے اسے کھینچے یا دھکیلے جا رہا ہے۔ اگر اتنا سامان ہو جتنا ہمارے ہاں اونٹ گاڑی میں عموماً ہوتا ہے تو ایک مرد یا عورت اسے کھینچ رہی ہو گی اور ایک یا دو اور مرد یا عورت اس کی مدد کر رہے ہوں گے۔ لیکن ہانپتے کانپتے نہیں، بڑے اطمینان اور آرام کے ساتھ جیسے خالی چل رہے ہوں۔ مویشی یا بار برداری کے جانور ہمیں خال خال ہی نظر آئے۔ زیادہ بھاری کاموں کے لیے ٹرک اور ٹریکٹر ہیں۔ لیکن زیادہ تر بار کشی انسان کرتے ہیں۔ بعض حالتوں میں سائیکل یا سائیکل گاڑیاں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والوں میں عورتوں کا تناسب تینتیس فی صد ہوتا ہے بلکہ زیادہ۔

ہسپتالوں میں تو کچھ مریض ہوتے ہی ہیں۔ عدالتیں بالکل ہی خالی رہتی ہیں۔ بعض اوقات ہفتوں کوئی کیس نہیں ہوتا۔ ایک پاکستانی دوست جو قانون سے دلچسپی رکھتے ہیں کوئی عدالت دیکھنا چاہتے تھے۔ پیکنگ کی عدالت عالیہ کے چیف جج نے کہا کہ بھیّا ہمارے ہاں تو بہت دن سے کوئی کیس نہیں لگا، ہاں فلاں گاؤں میں ایک مقدمہ ہے وہ چل کے دیکھ لو۔ چیف جج کو لے کر وہاں پہنچے۔ مقدمہ طلاق کا تھا۔ ایک کارخانے کے کاریگر نے عرضی دی تھی میری بیوی بہت بد مزاج ہے۔ بہت ہتھ

چھوٹ بھی ہے۔ تکرار اور مار پیٹ کرتی ہے۔ میری بڑھیا ماں کا خیال نہیں کرتی۔ میں اس سے علیحدگی چاہتا ہوں۔ وہاں اشٹام وغیرہ کا رواج نہیں، سادہ کاغذ پر لکھ کر عرضی دے دیجیے۔ پوسٹ کر دیجیے۔ دوسرے تیسرے روز عدالت بیٹھ جائے گی اور عموماً ایک ہی دن میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ وکیل بھی پارٹ ٹائم ہیں۔ ان کو فیس یا مشاہرہ حکومت کی طرف سے ملتا ہے اور ان کا کام مدعی یا مدعا علیہ کی بے جا پچ کرنا نہیں بلکہ قانون کی تشریح کرنا ہوتا ہے۔

خیر یہ لوگ اس گاؤں میں پہنچے تو عدالت شروع ہو گئی تھی۔ کوئی عبا قبا تھی نہ اونچی کرسی جج کا ہتھوڑا۔ ایک میز کے گرد جج بھی بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی مدعی بیٹھا چائے پی رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ اس کے علاوہ دو آدمی اس کے کارخانے کی انتظامیہ کے بھی موجود تھے۔

دوسری طرف اس کی بیوی اور بیوی کے کارخانے کے دو آدمی۔ ان آدمیوں نے دونوں کے حق میں شہادتیں دیں کہ محنتی کارکن ہیں۔ البتہ بیوی کے کارخانے والوں نے کہا کہ یہ بی بی مزاج کی تیز ہیں۔ کبھی کبھی مغلوب الغضب ہو جاتی ہیں۔

بیوی نے اس الزام کو تسلیم کیا کہ بے شک میرا مزاج بگڑا رہتا ہے لیکن میرا میاں

شام کو دیر سے گھر آتا ہے۔ ڈراما دیکھنے چلا جاتا ہے یا اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ اس کی ماں کا خیال بے شک میں نے کبھی نہیں کیا کیونکہ میری ماں بچپن میں انتقال کر گئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں ماں کیا ہوتی ہے۔ اب البتہ مجھے احساس ہوا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ مرد نے بھی کہا کہ میں جلدی گھر آجایا کروں گا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے راضی نامہ ہو گیا۔ جج نے کہا میں وقتاً فوقتاً تمہارے



گھر آکر دیکھا کروں گا کہ تم لوگوں کا ایک دوسرے سے کیسا سلوک ہے۔ معلوم ہوا

کہ اسّی نوّے فیصد صورتوں میں فیصلہ راضی نامے کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسا ہو تو وکیل اور ان کے دلال، سر شتہ دار اور اہلکار، عرضی نویس اور وثیقہ نویس بھوکے مریں اور کل ہی ایمپلائمنٹ ایکس چینج کے سامنے قطار باندھ کھڑے نظر آئیں۔



وہاں چلو، وہاں چلو

بے عیب ذات تو خدا کی ہے لیکن افسانہ طرازی کوئی ہمارے مغربی مصنّفوں سے سیکھے۔ چین کے متعلق اکیلے امریکہ میں اتنی کتابیں چھپ چکی ہیں کہ اُوپر تلے رکھیں تو پہاڑ بن جائے لیکن اکثر ان میں سے واشنگٹن اور نیویارک میں بیٹھ کے لکھی گئی ہیں۔ وہاں ایسے ریسرچ کے ادارے ہیں زیادہ تر سی آئی اے کے خوانِ نعمت سے خوشہ چینی کرنے والے، جو آپ کی طرف سے واحد متکلّم میں چشم دید حالات لکھ کر دینے کو تیار ہیں۔ آپ فقط اس پر اپنا نام دے دیجئے۔ بعضے پبلشنگ ہاؤس (مثلاً پراٰیگر) تو چلتے ہی سی آئی اے کے پیسے سے ہیں۔ مشہور رسالہ انکاؤنٹر بھی انہی اداروں سے سانٹھ گانٹھ رکھتا ہے۔ قیمت اس کی ڈھائی تین روپے ہے لیکن کراچی

کے بُک اسٹالوں پر ایک روپے میں مل جاتا ہے۔ معلوم ہوا پاکستان میں علم کا نور پھیلانے کے لیے اس کی قیمت خاص طور پر رکھی گئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ چیزیں سستی ہوں لیکن ایسا بھی نہیں کہ کل کلاں افیم سستی ہو جائے تو ہم کھانا شروع کر دیں اور زہر کی قیمت تین چوتھائی رہ جاتے تو موقع سے فائدہ اٹھا کر خودکشی کر لیں۔ آٹھ آٹھ دس دس آنے کی کتابوں کا سیلاب بھی آیا اور برابر آ رہا ہے جن کو اسٹوڈنٹ ایڈیشن کا نام دیا جاتا ہے۔ پراپیگنڈے کی کتابوں میں چند کتابیں بے ضرر قسم کی بھی ڈال دی جاتی ہیں کہ دیکھیے ہمارا مقصد تو فقط اشاعتِ تعلیم ہے۔

پچھلے دنوں ایک ایسی کتاب بھی اسٹال پر دیکھی جس کے مصنف کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس سے کوئی بات چین کی چھُپی ہوئی نہیں ہے کیونکہ مصنّف برسوں ہانگ کانگ میں رہا ہے۔ چہ خوش، ہانگ کانگ میں بیٹھ کر چین کے متعلق کتاب کا ایسا ہی ہے۔۔۔ جیسے کلکتے میں بیٹھ کر اور ڈھاکے سے نقل مکانی کر کے آنے والے متمول مارواڑیوں سے انٹرویو کر کے پاکستان کے متعلق کوئی کتاب لکھ دے۔ چین کے کمیونوں سے متعلق ایسی ایسی ہولناک کتابیں اور مضامین پڑھنے میں آئے کہ راتوں کی نیند حرام ہو۔ مطلع صاف ہوا تو دیکھا کہ کچھ بھی نہ تھا۔ چھوٹے کوآپریٹیو اداروں کو بڑے کوآپریٹیو اداروں میں بدل دیا گیا تاکہ وسائل ضائع نہ ہوں۔ ان

سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ کوڑے لگا لگا کر لوگوں سے محنت لینا محض لکھنے والوں کے زرخیز دماغ کی اختراع تھی۔ کمیون کیا ہیں، یہ ہم بھی دیکھ آئے ہیں اور ہم سے پہلے اور بعد چین جانے والے بھی۔ یہاں ٹائم، لائف اور پراپیگنڈے کے دوسرے آلات شور مچاتے رہ گئے کہ ۱۹۵۸ء میں بیک جست آگے بڑھنے کی تحریک (Great Leap Forward) نے چین کو دس سال پیچھے پہنچا دیا ہے۔ یہ شور تھا تو معلوم ہوا کہ گراں خواب چینی بیس سال اور آگے بڑھ گئے۔ پیکنگ میں دس ماہ کے عرصہ میں دس عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر بھی اسی "ناکام" تحریک کے تحت تھی۔ دریائے یانگسی پر از آدم تا انیدم پل نہ بنا تھا۔ ووہان کا شاندار پل اسی جست میں بنا۔ شنگھائی کا بھاری مشینوں کا کارخانہ دیکھئے تو عقل گم ہو جائے۔ بیچ میں روس سے بگاڑ ہوا اور روسی مشیر منصوبے ادھورے چھوڑ کر چین سے چلے گئے اور کہا جاتا ہے کہ اپنے منصوبے کے نقشے بھی ساتھ لے گئے۔ لیکن بجائے اس کے چین کے لوگ بد دل ہوتے یہ بات ان کے لیے تازیانۂ شوق ثابت ہوئی۔ نانکنگ میں ۱۹۵۷ء میں چار سو کمروں کا ایک ہوٹل بنا جس کے باتھ روموں میں ٹائل اور ہر کمرے میں فون تھا۔ متعدد لفٹ بھی تھے۔ معلوم ہوا کہ اس کی بنیاد کھدنے سے تکمیل اور قبضے تک کل سترہ ہفتے لگے۔ اس میں وہ بڑے بڑے درخت بھی شامل

تھے جو اس ہوٹل کے احاطے پر چھائے ہوتے ہیں۔

خیر ذکر کمیونوں کا تھا اور ان کے متعلق مغربی پراپیگنڈے کا۔ آج کل سُرخ محافظوں یعنی ریڈ گارڈز کے متعلق جو اتنا کچھ پڑھنے کو مل رہا ہے وہ بھی گرد ہٹ جانے پر دیکھنا چاہیئے۔ حقیقت کتنی تھی اور افسانہ کس قدر، خبروں پر ہی جانا ہے تو ماؤزے تنگ کو یہ لوگ کئی بار نشانۂ اجل بنا چکے ہیں۔ جہاں اس نے کسی تقریب میں شرکت کا ناغہ کیا، اخبار والے بولے جناب! اب کے تو ضرور مر گیا۔ جن دنوں ہم چین میں تھے ان دنوں امریکی اور جاپانی اخباروں نے ان کو نئے سرے سے تہ تیغ کیا تھا۔ ایک جاپانی اخبار میں پیکنگ میں مقیم مغربی سفیروں کے حوالے سے خبر چھپی کہ ماؤ صاحب ایک دعوت میں گئے تھے وہاں ان کو کھانے میں زہر دے دیا گیا۔ دعوت میں فلاں فلاں لوگ بشمول چاؤ این لائی موجود تھے۔ ہمارے یہاں جس خبر کے متعلق ذرا سا بھی اشتباہ ہو اس کے ساتھ مبینہ وغیرہ کا لفظ لکھا جاتا ہے یا یہ تحریر ہوتا ہے کہ اس کی تصدیق تا حال نہیں ہوئی لیکن اس خبر کے ساتھ اس قسم کا کوئی تکلف نہ تھا۔

ہم نے پیکنگ میں ماؤزے تنگ صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو یہ جواب ملا کہ اِن دنوں پیکنگ میں نہیں، دیہات میں گئے ہوئے ہیں۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو یہ

بہانہ ہے۔ بڑے میاں کا وصال ہو چکا ہے۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد ہی وہ دریائے یانگسی میں پیراکی کرتے نظر آئے۔ اس کا جھٹلانا تو مشکل تھا لیکن بیمار اور قریب المرگ تو ان کو اب بھی ظاہر کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک انگریزی روزنامے نے لکھا کہ ماؤزے تنگ میں کہاں اتنی ہمّت کہ تیز سکے۔ وہ تو دو آدمی نیچے ڈبکی مارے ہوتے تھے اور ماؤ کے دونوں پاؤں کو اپنے کندھے پر اٹھائے تھے ان اخبار نویسوں کو گھر پہنچانے میں چینیوں کو خاص مزہ آتا ہے۔ اب ماؤزے تنگ صاحب نے ہر جلسے میں شریک ہونا شروع کر دیا ہے، چاہے وہ کسی کے ختنے یا منگنی کی تقریب ہی کیوں نہ ہو۔

آیئے آج پیکنگ سے ووہان چلیں۔ یہ وہی شہر ہے جہاں ماؤزے تنگ صاحب نے پیراکی کا مظاہرہ کر کے دشمنوں کی چھاتی پر مونگ دلا تھا اور اسی شہر میں ہمارے دوستوں شرکت صدیقی اور اشفاق احمد کو ان سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ اشفاق احمد صاحب نے تو سنا ہے اس شرف کو برقرار رکھنے کے لیے اس دن کے بعد سے ہاتھ بھی نہیں دھوئے۔ بس رومال باندھے رہتے ہیں۔ کوئی بہت ہی قریبی دوست ہو تو ننگے ہاتھ سے مصافحہ کر کے اس کا تبرّک اس کو منتقل کرتے ہیں۔ خیر، یہ شہر دریائے یانگسی پر واقع ہے، اور شنگھائی سے کوئی دو سو میل مغرب میں پڑتا ہو

گا۔ اصل میں یہ ایک نہیں تین شہر ہیں۔ جن میں ایک ہانکو ہمارے لیے زیادہ معروف ہے۔ کیونکہ انگریزوں نے کمزور چینی شہنشاہوں سے زبردستی کے معاہدے کر کے جن شہروں اور بندر گاہوں کو اپنے تصرف میں لے لیا تھا، ان میں کینٹن، شنگھائی اور تائنسن کے علاوہ ہانکو بھی تھا۔ ہم یکم مئی کا تہوار پیکنگ میں دیکھنا چاہتے تھے لیکن ہم سے کہا گیا کہ سب جگہ ایک سی بات ہے۔ ووہان میں دیکھو۔ وہاں کے وائس گورنر صاحب آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ احوال اس انتظار کا کچھ اس قسم کا ہے کہ ایک شاہ صاحب قبائلی علاقے میں جا نکلے۔ وہاں کے لوگوں نے بہت عزّت و تکریم کی۔ نذر نیاز سمیٹنے کے بعد انہوں نے واپسی کی ٹھانی تو میز بانوں نے کہا "واہ شاہ صاحب! اب آپ کو جانے کون دے گا۔ ہم تو آپ کو مار کر یہیں آپ کا مزار بنائیں گے۔ ہمارے گاؤں میں فی الوقت کوئی درگاہ نہیں ہے۔ بہت دور جانا پڑتا ہے۔ خیر چینی لوگ ہماری درگاہ تو نہ بنانا چاہتے تھے۔ لیکن چین میں پاکستانی لوگ شاہ صاحب ہی گنے جاتے ہیں اور ان کی عزت و تکریم اسی پیمانے پر ہوتی ہے۔ پیکنگ میں تو اور بھی بہت سے پاکستانی تھے۔ ووہان والوں نے کہا کہ پاکستانی ادیبوں کو ہمارے ہاں بھیج دیجئے تو ہماری بھی عید ہو جائے۔

ووہان کا شہر سرسری گزرنے کی چیز نہیں ہے۔ اس کے در و دیوار پر انقلاب کی

چھینٹیں ہیں۔ ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۷ء کی پہلی انقلابی سول وار میں جو چیانگ کائی شیک اور بائیں بازو والوں کے درمیان ہوئی۔ ووہان انقلابی حکومت کا مرکز تھا۔ اینا لوئی اسٹرانگ مشہور امریکی جرنلسٹ ۱۹۲۵ء میں چین کے حالات کا مطالعہ کرنے کینٹن پہنچیں تو لوگوں نے ان سے یہی کہا کہ بی بی یہاں کیا دیکھو گی، کچھ دیکھنا ہے تو ووہان جاؤ۔

ووہان میں یکم مئی کو ایسی سردی تھی کہ اوورکوٹ کے بغیر گزارہ نہ تھا۔ اسی ووہان کی گرمی کی شکایت شوکت صدیقی اور اشفاق احمد سے بھی سنی جو ہم سے ڈیڑھ دو ماہ بعد وہاں گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ دہکتا تنور بنا ہوا تھا۔ رات کو پیٹ پر بھیگا ہوا تولیہ رکھتے تھے تو نیند آتی تھی۔

ہمارا ہوٹل، وکٹری ہوٹل، اب سے پچاس برس پہلے کے یورپین طرزِ تعمیر کا نمونہ تھا۔ اس کے آس پاس بھی نفیس ڈُھلی ہوئی اینٹوں کے مکانات تھے۔ ہماری کھڑکیوں میں سے دریا، دریا میں کشتیاں اور کشتیوں میں مال اسباب ایک ساحلی شہر کا مثالی نظارہ تھا۔ اس شہر میں ہم کو یکم مئی کی ریلی دیکھنی تھی۔ بھاری صنعتوں کا کارخانہ دیکھنا تھا۔ پارٹ ورک پارٹ اسٹڈی اسکول دیکھنا تھا۔ جس میں پڑھنے والے کام کرتے ہیں یا کام کرنے والے پڑھتے ہیں اور فارغ التحصیل ہوتے ہی ذمہ داری کے

صنعتی کام سنبھال لیتے ہیں۔ پہلی فیکٹری بھی ہم نے عمر میں یہیں دیکھی۔ اس سے پہلے اس کے شکوہ اور وسعت کا اندازہ نہ تھا۔ لیکن سب سے پہلے ہماری آمد کی شام کو یانگسی کے پُل کا پروگرام تھا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا آج تک اس باغی اور سر شور دریا پر کوئی پُل نہ بن سکا تھا۔ مال سامان اور مسافروں کے علاوہ فوجیوں کی آمدورفت اور بار برداری کے لیے کشتیاں اور بجرے استعمال ہوتے تھے۔ یہ پل کوئی میل بھر لمبا ہے۔ ہم جو پل کے سرے پر پہنچے تو کاریں ٹھہر گئیں۔ پل کا محافظ یا متولی جو کچھ بھی وہ تھا ہمارے خیر مقدم کو موجود تھا۔ اس نے ایک ایک پیتل کا بیج ہمارے کوٹوں پر ٹانکا جس پر پل کا ایک نمونہ بنا تھا اور کہا آیئے بسم اللہ۔ یہ کہہ کر وہ ایک لفٹ کے پاس لے گیا کہ صاحبان ایک پیالی چائے تو پی لیجئے۔

عین پل کے پیل پائے کے جوف میں وسیع دالانوں والی نشست گاہ تھی جس کی کھڑکیاں دریا پر کھلتی تھیں، یہ نشست گاہ صوفوں، قالینوں اور تصویروں سے مزیّن تھی۔ حسب رواج پہلے اس پل کی تفضیل بتائی گئی کہ بہت مختصر عرصے میں بنا۔ پھر چائے آئی۔ پھر پل کی سیر ہوئی۔ پورا پل تین منزلوں میں ہے۔ اُوپر سے موٹریں ٹرک اور دوسرا ٹریفک گزرتا ہے۔ اس کے نیچے کی منزل میں ریلوے لائن ہے اور اس کے نیچے سے پانی کے جہاز گزرتے ہیں۔ کل خرچ اس پر تیرہ کروڑ روپیہ آیا۔

ہماری ٹیم کے ایک بزرگ اس پل کی عظمت اور شان سے ایسے متاثر ہوئے کہ میزبان سے پوچھنے لگے کہ اس پل کو جن انجنیئروں نے بنایا ان کا کیا حشر ہوا؟

میزبان نے تعجب سے کہا: ”حشر؟ کیا مطلب؟“ تب ان بزرگ نے وضاحت کی کہ تاج محل جن انجنیئروں نے بنایا بعد میں بادشاہِ وقت نے ان کو مروا دیا تھا تاکہ ایسی کوئی اور عمارت نہ کہیں بنا دیں۔ ہمارے میزبان نے معذرت کی کہ ہم لوگوں کو اس قسم کی احتیاط کا خیال نہیں آیا۔ بلکہ غلطی یہ ہوئی کہ ان انجنیئروں کو ترقّی دے دی گئی اور ان لوگوں کے حوصلے ایسے بڑھے کہ انہوں نے اور کئی پل بنائے جن کی وسعت و شوکت کے سامنے یہ ہمارا پل کچھ بھی نہیں۔



اے مرے گھوڑے آہستہ

یکم مئی کا پروگرام بہت رنگارنگ تھا۔ ایک پارک میں کسی کلچرل مرکز کی عمارت تھی۔ اس کے ایک بہت وسیع آڈیٹوریم میں لوگوں کے لیے سینما کا انتظام تھا۔ کچھ ادھر مداری کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کچھ دوسرے کھیل کھیل رہے تھے۔ رنگارنگ لباس، طالب علم، مزدور، غیر مزدور، تیری درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ ہم نے اپنے لیے عوامی گیتوں کے ایک پروگرام کو پسند کیا۔ مختلف علاقوں کی سنگیت منڈلیاں آئیں اور اپنے جوہر دکھا گئیں۔ ہمارے لیے ترجمے کا انتظام بھی تھا۔ گیت تو بہت تھے لیکن ایک ہمارے ایسا جی لگا کہ ہم مصرع بہ مصرع ترجمہ کرتے گئے۔ اُدھر ان کا گیت ختم ہوا، اِدھر ہمارا مکمل تھا۔ ان کو تو کیا سناتے، آپ کو سناتے ہیں۔

یہ عوامی گیت نئے زمانے کا ہے اور جمبول جابر کے گیتوں کی یاد دلاتا ہے۔

آہستہ

آہستہ

اے مرے گھوڑے آہستہ سبزہ زار کے منظر دیکھ

موٹر دیکھ ٹریکٹر دیکھ

اُجلے صاف گھروندے دیکھ

باڑیاں کھیت طویلے دیکھ

بجلی کے یہ کھمبے دیکھ

سبزہ زار کے چرواہوں کے

ہاتھوں کی محنت کے پھل

میں بھی دیکھوں تو بھی دیکھ

اے مرے گھوڑے آہستہ

آہستہ

چاروں جانب سبزہ ہے

اس سبزے پر بھیڑیں ہیں

بھیڑیں۔۔۔ جیسے آسمان پر

بادل سے گھِر آئے ہوں

آج مِرے دل میں بھی خوشیاں

بادل بن گھِر آئی ہیں

بادل بن کر چھائی ہیں

چاروں اور سہانے منظر پورب پچھم دکھن اُتّر

میں بھی دیکھوں تو بھی دیکھ

اے مرے گھوڑے آہستہ

آہستہ

گیت تو اور بھی تھے لیکن شعریت ہمیں اسی گیت میں نظر آئی۔ باقی کا انداز ذیل کے بولوں سے جان لیجئے۔

سردی سے نہیں ڈرتے

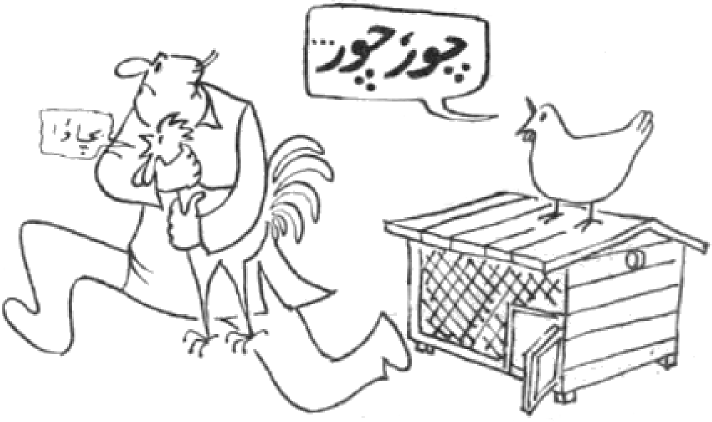
گرمی سے نہیں ڈرتے

محنت سے نہیں ڈرتے

کلفت سے نہیں ڈرتے

ہم لوگ تو جیالے ہیں

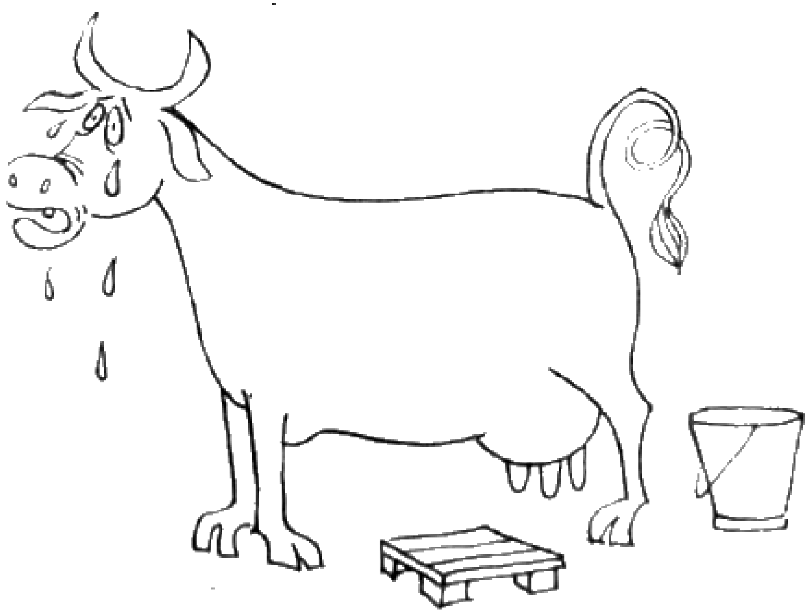
ہاں ہمّت والے ہیں



ہماری پہلی منزل پیکنگ تھی، وہاں پر کاریں ہماری سواری میں تھیں اگر پھٹیچر نہیں تو کوئی ایسی عمدہ بھی نہ تھیں۔ ووہان میں اس سے اچھی، کینٹن میں اس سے اور بہتر، ہانگچو میں اور زیادہ عمدہ۔ شنگھائی میں نہایت شاندار اور سوچو میں کہ ہماری آخری منزل تھا یہ لگتا تھا کہ ابھی ابھی کارخانے سے آئی ہیں۔ زیادہ لوگ پیکنگ جاتے ہیں۔ بہترین کاریں وہاں رکھنی چاہتی تھیں لیکن یہ بھی چینیوں کی ایک ادا ہے۔ اگر کہو تمہارے ملک نے بہت ترقی کی ہے، تو وہ کہیں گے اجی کہاں ابھی تو بہت غریبی ہے۔ ہاں کوشش کر رہے ہیں۔ پتلونوں پر لوگ پیوند لگائے پھرتے ہیں۔ یونیورسٹی میں گئے تو پیوند والے طالب علم سب سے اگلی صف میں ڈاکٹر کے ہاں گئے تو وہ بھی بیٹھا مطب میں جھاڑو دے رہا تھا۔ پیوند اس کے بھی دونوں گھٹنوں پر تھے۔ پھر ایک

دو نہیں بعضوں کے لباس پر تو دس دس بیس بیس پیوند۔ یہ بات نہیں کہ چین میں کپڑے کا توڑا ہو۔ بازار بھرے پُرے، خریداروں کے، ہجوم استطاعت بھی موجود ہے۔ کمیون دکھانے گئے تو بولے کیا دیکھو گے؟ اچھے بھی ہیں اور ایسے بھی جن میں ابھی آغاز ہے اور لوگوں کا ظاہری احوال؟ بس دیکھئے گا۔ ہم نے کہا۔ ہمیں تو اپنا بد ترین کمیون دکھاؤ۔ یہ بات کینٹن کے نواحات کی ہے، شہر سے کوئی چالیس میل دُور کچھ پرانے زمانے کے دیہات کا مجموعہ تھا۔ کمیون کے دفتر میں بھی دیہاتیوں نے میز کرسیاں خود ہی ٹھوک پیٹ کر بنا رکھیں تھیں۔ ایک کارخانہ چھوٹی موٹی اور صنعتی مشینیں مرمت کرنے کا بھی اسی کمیون کا حصّہ ہے۔ ایک دوسری فیکٹری میں۔۔۔ اسے فیکٹری کہیئے یا پڑادہ کہیئے، سینیٹری پائپ وغیرہ بنتے ہیں اور ان سے معقول آمدنی ہوتی ہے۔ اس کے ایک طرف کچھ تیزاب اور دوسرے کیمیکل بنانے کی فیکٹری بھی تھی۔ آگے ایک مرغی خانہ تھا۔ بڑی موٹی اور مسٹنڈی مرغیاں تھیں۔ ہمارے ہمسائے میں ہوتیں تو ہم کبھی نہ چھوڑتے، ضرور چُرا کر احباب کی دعوت کرتے۔ ایک طرف گائے بھینسوں کا باڑا تھا۔ ہمارے کوی جسیم الدّین تو وہیں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے۔ ایک گائے کو انہوں نے دوہا بھی۔ ان کا دودھ پوچھا، کتنا دیتی ہیں؟ اور آیا خالص بھی ہوتا ہے؟ ہمارے کوی جی رہتے ڈھاکے شہر میں ہیں اور

یورپ، امریکہ سب جگہ گھوم آئے ہیں لیکن دل ان کا دیہات میں ہے۔ ہم ڈھاکے جائیں تو ہماری گُڑ کی دعوت کرتے ہیں۔ اور گھر کو انہوں نے مویشیوں کا باڑا بنا رکھا ہے۔ پچھلے آنگن میں پورا گلہ کھڑا ہے اور چونکہ ان کے ٹائلٹ کا انتظام ایسا ہی ہے بالعموم ہمارے ہاں ہوتا ہے اس لیے ان کا ہی نہیں، سارے محلے والوں کا مشام جاں ہمیشہ معطّر رہتا ہے۔ خیر تو قصّہ یہ کہ کوی صاحب کو ان گائیوں سے بجز الگ کرنا پڑا۔ پھر بھی ان کی نگاہ واپسیں میں کچھ اسی قسم کی فریاد تھی۔ مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے۔



ان کارخانوں میں بھی لوگوں کے کپڑے صاف بے شک تھے لیکن موٹے جھوٹے اور نیلے بد رنگ۔ خیر نیلا تو ان لوگوں کا قومی رنگ ٹھہرا۔ اب ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں سے بچ کر گاؤں میں گئے۔ ارشاد ہوا کہ جس گھر میں چاہو جاؤ۔ اچھے بُرے ہر طرح کے مکانات تھے۔ گھروں میں زیادہ تر بوڑھیائیں تھیں یا چھوٹے بچّے۔ بڑی خندہ پیشانی سے گھر کے اندر لے جاتیں۔ پرانے گھر تھے۔ ایک بڑھیا نے بتایا کہ انقلاب سے پہلے تو ہمارے پاس گھر تھے ہی نہیں۔ بس بیگاری مزدوروں کی زندگی تھی۔ یہ سارے گھر زمینداروں کی ملکیت تھے۔ لیکن اب تو ہمارے ہیں، یہ فصلیں اور کھیت بھی۔ جوان بیٹے اور بہوئیں کام پر گئی ہوئی تھیں۔ ایک پڑوس کی بڑھیا اس گھر میں چاول کوٹنے آئی تھی۔ ہمارے دیہات کی گھِر گھِر کرنے والی چکیاں جن پر گھر کی بی بی تڑکے ہی اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور جس کی سریلی آواز ہمارے لیے لوری کا کام دیتی تھی، ان چینی دیہات کے لیے بڑی ترقّی یافتہ مشین شمار ہوگی کیونکہ یہ تو ایک گڑھا تھا جس میں لکڑی کا ایک ہتھوڑا جا کر پڑتا تھا اور ڈھنگلی کے اس سرے پر ایک عورت اسے دباتی اور چھوڑتی تھی اور ایک لمبی لٹھیا سے چاولوں کو الٹی پلٹتی تھی کہ ہتھوڑے کے نیچے آتے جائیں۔ ہمارے مشرقی پاکستان میں اب بھی دھان یونہی کوٹا جاتا ہے۔ خیر ایک طرف یہ تھا اس کے برابر ہی باورچی

خانہ۔۔۔اسی کمرے میں ایک طرف کو چھوٹی سی چار فٹ اونچی دیوار کھینچ کر سؤر کا باڑا بنا رکھا تھا۔ خواب گاہ البتہ الگ تھی اور سارے گھر میں سب سے اچھی وہی ہوتی ہے۔ چھپر کھٹ ہر گھر میں۔ اوپر چھت، اِدھر اُدھر کھینچنے کے لیے پردے۔ اندر تخت۔ اس پر بیل بوٹے دار فرش۔ جو کیفیّت اس گھر کی قریب قریب ویسی ہی دوسرے گھر کی۔ باہر سے یہ گاؤں ہمارے ہی دیہات کا سا تھا۔ اور اندر گلیاں بھی۔



اس کمیون کے بعد اور بھی کمیون دو تین دیکھے۔ لیکن باقی سب کا احوال ان سے کہیں اچھا، ترقّی یافتہ، ایک بار تو یہ خیال بھی ہوا کہ جس طرح چینی عورتیں اپنی عمر

زیادہ کر کے بتاتی ہیں اسی طرح غیر ملکیوں کو دکھانے کے لئے ان لوگوں نے کچھ
کمیونوں میں غریبی کے حالات رکھ چھوڑے ہیں۔ واللہ اعلم

تنخواہ ہماری زیادہ ہے

چنوں کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ ہم شاعر ہیں۔ اب کیسے شاعر ہیں اس سے کسی کو کیا بحث بہر حال اس کا التزام رکھتے ہوئے ہمارے ترجمان ایسے مقرر کئے جو سبھی ہم قافیہ تھے۔ ایک ان میں مسٹر کُو تھا، ایک چُو، ایک فُو اور ایک شُو۔ ہمارے لیے مشکل یہ تھی کہ کس کو کس نام سے پکاریں سب گڑ بڑ ہو جاتا تھا۔ باقی تو سب انگریزی کے تھے، مسٹر کُو البتہ اُردُو بھی بولتے تھے، اور انگریزی بھی۔ اُردُو بولتے تھے سہج سہج لیکن صحیح۔ زبان کا اشتراک بھی عجب چیز ہے، ہماری فوراً ان سے دوستی ہو گئی۔ دیوارِ چین سے واپس آتے میں یہ ہمارے اور سید وقار عظیم کے ساتھ بیٹھے۔

ہم نے پوچھا "میاں تنخواہ کیا ہے؟"

بولے ”ساٹھ یوان “یعنی ایک سو بیس روپے۔

ہم نے کہا ”گزارہ کیسے ہوتا ہے؟“

بولے ”مزے میں ہوتا ہے۔ یہ پوراسوٹ،بش شرٹ اور پتلون تیرہ روپے کا ہے۔ مکان کا کرایہ پانچ روپے۔ بجلی پانی سب اس میں شامل“!

ہم نے کہا ”تنہا رہتے ہو؟“

بولے ”نہیں دو کمرے کا فلیٹ ہے۔ ایک اور صاحبہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔“

”وہ کون ہیں؟“ ہم نے پوچھا۔

بولے ”ایک اسکول میں استانی ہیں۔“

ہم نے سوچا لیجئے، بے راہ روی کی ایک مثال تو سامنے آئی۔ راز داری سے پوچھا ”میاں اس سے عشق وشق بھی جھاڑتے ہوگے، آخر نوجوان آدمی ہو۔“

شرما کر بولا ”جی ہاں جھاڑتا ہوں۔ وہ میری بیوی ہے۔“

”ہت تیرے کی“ کہہ کر ہم تو چپ ہو گئے۔ وقار عظیم صاحب نے پوچھا کہ ”شادی

کیسے ہوئی تھی؟ کتنے گہنے ڈالے گئے؟ کتنا جہیز دلہن کے والدین نے دیا؟ آرسی مصحف، چوتھی، چالے وغیرہ کی تفصیل بتاؤ۔" وہ حیران ہو کر بولا: "یہ کیا چیزیں ہیں؟ یہ ہمارے ہاں نہیں ہوتا۔" ہم نے پوچھا۔ "کل کتنا خرچ تمہاری شادی خانہ آبادی پر ہوا؟" حساب لگا کر بولا۔ "بس پچاس یوان" یعنی سو روپے کے لگ بھگ، اس میں آدھا میں نے ڈالا، آدھا میری بیوی نے۔" سید وقار عظیم بولے۔ "قاضی کی فیس بھی اس میں شامل ہے۔" کُوصاحب نے کہا۔ "نہ قاضی نہ فیس، ایک شخص ہے اسے رجسٹرار کہہ لیجیے۔ اس کے دفتر میں جا کر کہا کہ ہمیں رشتۂ مناکحت میں باندھ دیجئے۔ اس نے میرے اور میری بیوی کے کارخانوں کے مینجروں سے چال چلن کی تصدیق کی اور ہمارے حق میں دعائے خیر کی۔ بس شادی ہو گئی۔" ہم نے کہا "پھر یہ اتنا زرِ کثیر۔۔۔ سو روپے کس بات پر خرچ آئے؟" بولے "وہ؟ اجی ایک جوڑا اپنا بنایا، ایک دلہن کو دیا۔ میرا جوڑا انہوں نے بنایا۔ اُن کا میں نے۔ اس کے بعد ہم نے دعوت کی۔ لوگوں کو مٹھائی کھلائی۔" ہم نے پوچھا۔ "دلہن کے والدین اور ظالم سماج کا اس کہانی میں ذکر نہیں آیا۔" کُونے کہا۔ "ظالم سماج کو تو میں نہیں جانتا کون صاحب ہیں۔ ہاں ان کے والدین سے رضا مندی ضروری تھی۔ ہمارے ہاں بالعموم لی جاتی ہے اور وہ عموماً اجازت دے ہی دیتے ہیں۔"

چُو سے ہم نے ایک موقع پر احوال پوچھا تو وہ بولا کہ ”میرا باپ فلاں شہر میں ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ ساٹھ یوان یعنی ایک سو بیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ میں خود چھپّن یوان لیتا ہوں اور میرا بڑا بھائی بتیس یوان پاتا ہے لیکن وہ ابھی اپرنٹس ہے۔“ ہم نے پوچھا ”کچھ گھر بھی بھیجتے ہو۔۔۔۔؟“ وہ کہنے لگا، ”ہاں ماں کو پیسے بھیجتا ہوں اور پڑھتا بھی ہوں۔ بی اے پاس کر لیا ہے۔“ ہم نے کہا ”اس کا بھی خاصا خرچ ہو گا؟“ معلوم ہوا اس کا کچھ خرچ نہیں۔ پڑھائی مفت ہے۔

شُو بہت اچھا آدمی تھا۔ ہنس مکھ، تیز طرار، لیکن فُو ذرا رومانی تھا۔ خدا جانے پیر حسام الدّین راشدی صاحب نے کیسے تاڑ لیا کہ مریضِ عشق ہے۔ اس کی نبض پر ہاتھ رکھا تو اس نے سب اُگل دیا کہ ہاں اس دل کے جھروکے میں اک رُوپ کی رانی ہے۔ ہم تو خیر دیگر علوم کی طرح اس میں بھی کورے تھے لیکن ہانگ چُو کی جھیل پر چودھویں کی رات کو بارہ بجے پیر صاحب اور اعجاز بٹالوی نے اس کو حافظ اور میر کے اشعار کے حوالوں سے ایسے ایسے گُر بتائے کہ اے کاش ہمیں بتائے ہوتے۔ یا ان صاحبوں نے خود بھی استعمال کئے ہوتے۔ جب ہم نے اسے چھوڑا ہے تو محبت کے اثر سے بالکل ہم ایسا ہو گیا تھا۔ آہیں بھرتا تھا، پُر درد اشعار پڑھتا تھا۔ رات رات بھر جاگتا تھا۔ غالباً پیر صاحب نے اسے کوئی وظیفہ بھی بتایا تھا اور تعویذ بھی دیا تھا۔ ہم

نے مزید تحقیق نہیں کی لیکن یہ سچ ہے کہ از کارِ رفتہ ہو گیا تھا۔

آج ہمارا موضوع تنخواہ ہے عاشقی نہیں۔ ہاں رنگِ طبیعت کی مناسبت سے بات لمبی کر گئے۔ ووہان میں ہم نے بھاری مشینوں کا ایک جغادری کارخانہ دیکھا۔ فرلانگوں لمبی، دیو ہیکل عمارتوں میں دیو ہیکل مشینیں بھری تھیں۔ کُل کام کرنے والوں کی تعداد سات ہزار ہے اور یہ ایک فیکٹری دراصل میں فیکٹریوں کا مجموعہ ہے۔ ان سات ہزار میں سولہ سو عورتیں ہیں اور اوسط عمر ۲۷ سال، باقی تفصیلات جاننی ہوں تو ہمارے دوست ڈاکٹر وحید قریشی سے رجوع کیجئے۔ وہ ریسرچ کے آدمی ہیں۔ اگر کوئی آدمی چھینکتا بھی تھا تو وہ اس میں نوٹ کر لیتے تھے۔

پاس ہی فولاد کا کارخانہ تھا۔ یہ بھی دیکھنے کی چیز تھا۔ لوہا پگھلتا، ڈھلتا، ضربیں کھاتا، ٹھنڈا ہوتا اور غلام بنتا سب دیکھا۔ اس میں ساڑھے تین ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ اوسط تنخواہ ۶۵ یوان یعنی ایک سو تیس روپے ہے۔ ڈائریکٹر کو ڈیڑھ سو یوان ملتے ہیں۔ ہم نے پوچھا "سب سے زیادہ تنخواہ کون پاتا ہے یہاں۔۔۔؟" معلوم ہوا مینجر صاحب ہیں۔ ایک سو اسّی یوان لیتے ہیں۔ پتہ چلا کہ چو این لائی اور لیو شاؤ چی کی تنخواہیں ساڑھے تین سو یوان فی کس ہیں۔ صدر ماؤزے تنگ البتہ بیش قرار مشاہرہ پاتے تھے۔ چار سو یوان۔ پچھلے دنوں جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ کہہ دیا مجھے

اتنے کی ضرورت نہیں۔ غیر ملکی مہمانوں کو کھلا پلا کر بھی کچھ بچ رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کی بھی ساڑھے تین سو یوان کر دی گئی ہے۔



معلوم ہوا کہ یہاں لوگ تنخواہ خود ہی گھٹاتے بڑھاتے ہیں۔ جب کسی کے کوئی بچہ ہوا یا کوئی اور خرچ بڑھا تو کارخانے یا اس شہر کے لوگ جلسہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہاں بھئی ان صاحب کی پگار بڑھاؤ۔۔۔ چنانچہ بڑھ جاتی ہے۔ ہاں آکر ہم نے اپنی

بہن سے ذکر کیا تو بولیں، ”واہ یہ چین ہے جس کی آپ اتنی تعریفیں کرتے ہیں۔ ماؤزے تنگ سے زیادہ تو تنخواہ آپ ہی کی ہے۔“ ہم نے کہا ”ہم سے زیادہ تنخواہ فلاں صاحب کی نہیں کیا۔۔۔؟ حالانکہ وہ ہم سے بھی زیادہ نالائق ہیں۔“ اس پر وہ چپ ہو گئیں۔

کھانے تو ہم نے بہت کھائے۔ ایک سے ایک پُر تکلّف سولہ سولہ کورسوں کے قدحے میز پر آئے تھے لیکن جو مزا اس قیمے کے نمکین مسالے دار بند میں آیا جو ہم نے ووہان کی اسٹیل فیکٹری میں مزدوروں کی کینٹین سے ایک آنے میں خرید کر کھایا، اس کا مزہ کبھی نہ بھولے گا۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ لوگ کیا کھاتے ہیں۔ اس ایک بند میں خوشبو، لذّت سبھی کچھ بند تھا۔ ایک پیالہ سُوپ کا اور اس کے ساتھ ایک آنے کا بند، آپ بہت کھانے والے ہیں، تو دو لیجئے۔ چاول بھی لے سکتے ہیں۔ یہاں بھی گرم پانی کی ٹنکی چڑھی تھی۔ کھاتے جاؤ اور اپنے اپنے مگ بھر کے پیتے جاؤ۔

چین میں یہ لوگ اتنے محتاط تھے کہ ہمارے لیے کچن ہی الگ ہوتا تھا جہاں کسی نے گفتگو میں سوَر کا نام لیا۔ انہوں نے کان پر ہاتھ رکھا۔ نہ نہ مسلمان، اسلام۔ یہ تو کھانے کی بات ہے فلیکس گرین نے ایک کارخانے میں دیکھا کہ اس کے ہیر کٹنگ

سیلون میں مسلمانوں کے لیے تو لیے الگ، قینچیاں الگ، استرے الگ۔ کیا مجال جو کسی اور کا اُسترا کسی مسلمان کے بالوں کو چھو جائے۔ شہرت یہ ہے کہ مسلمان بہت صفائی پسند ہوتے ہیں، یہ سچ ہے تو بڑی خُوشی کی بات ہے۔ ورنہ۔۔۔۔

اب آپ ماؤزے تنگ کا کلام سنئے



افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی

قارئین کرام۔ اب آپ صدر ماؤزے تنگ کا کلام ملاحظہ فرمایئے۔ نئے چین کی شاعری میں اگر کہیں لطافت، نرمی اور رومانویت ملتی ہے تو فقط چیئرمین ماؤ کے ہاں۔ یہ ان کی اُن دس مشہور نظموں میں سے سات ہیں جو پچھلے دنوں پوری آب و تاب سے چین کے سرکاری پبلشنگ ہاؤس نے چھاپی ہیں:

پریوں کی گپھا

(پریوں کی گپھا، لوشان کے پہاڑ پر ایک خوش منظر جگہ ہے)

رنگ ڈالے شفقِ شام نے شمشاد کے پیڑ

ابرِ خاموش کے لکّے ہیں فضاؤں میں رواں

روپ قدرت کا ہے پریوں کی گپھا میں مرکوز

قلّہِ کوہ پہ ہے حُسن یہاں، حُسن وہاں

۹ ستمبر ۱۹۶۱ء

ملیشیا دستوں کی لڑکیاں

(ایک تصویر پر آٹو گراف)

روشن چہرے، بڑی دلاور، لانبی زلفیں شانوں پر
صبح پریڈ کے میدانوں میں چین کی بیٹیاں آتی ہیں
اطلس سے یا نرم اور نازک ریشم سے انہیں کیا لینا
دل والی ہیں اور دل اپنی وردی ہی سے لگاتی ہیں

فروری ۱۹۶۱ء

سرما کے بادل

جاڑے کے بادلوں پہ جمی ہے مہین برف
جیسے کہ اُڑتے پھرتے ہیں گالے کپاس کے
پیڑوں کے پھول جھڑ چکے، باقی ہے ایک آدھ

ٹھنڈی ہوائیں چرتی ہیں یہ سینۂ فضا

گرمی ہے ایک دھرتی کے انفاسِ نرم میں

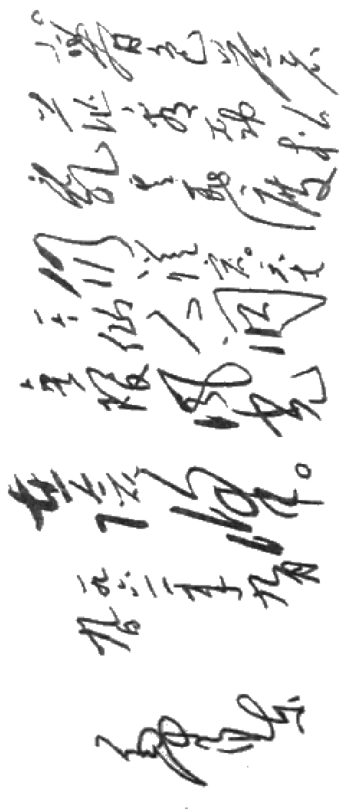
باگھوں سے کب ڈرے ہیں ہمارے جری جواں

چیتے ہوں یا کہ ریچھ ہوں ان کا بھی منہ کہاں

طوفاں بادِ سرد میں غنچے تو خوش رہیں

طوفانِ بادِ سرد سے مرتی ہیں مکھیاں

۲۶ دسمبر ۱۹۶۲ء



نظم پریوں کی گپھا کے مسوّدے کا عکس

ایک دوست کے خط کے جواب میں

چٹے بادل تیر رہے ہیں کیوی کوہ کی چوٹی پر

قلّہِ سبز سے دوشِ ہوا پر راجکماریاں اُتری ہیں

بانسوں کے پیڑوں پر اب بھی داغ ہیں ان کے اشکوں کے

لیکن اب تو ان کے روشن اور چمکیلے پیراہن

آسمان کے لال گلابی بادلوں کو بھی شرمائیں

جھیل میں سرکش بر فیلی موجوں نے دھوم مچائی ہے

دریا کاٹاپو بھی اب تو

دھرتی کے دہلانے والے گیتوں سے گونج اٹھا ہے

اور میں سپنوں میں کھویا ہوں

اس پھولوں کی دھرتی کے سپنوں میں جس کو

صبح کے سورج کی کرنوں کی جوت سدا روشن رکھتی ہے

۱۹۶۱ء

لُوشان پربت پر چڑھ کر

(یہ کیانگسی صوبے کا ایک ٹھنڈا پہاڑ ہے)

مینسی دریا اس اونچے پربت کے نیچے بہتا ہے

جس کی تیکھی لگریں چڑھتا میں چوٹی پر پہنچا ہوں

اور چوٹی کے اوپر دیکھو ہرے بھرے ان پودوں کو

میری نظریں سات سمندر پار یہاں سے جاتی ہیں

گرم ہوائیں مینہ کی بوندیں پانیوں پر ٹپکاتی ہیں

نو ندیوں میں سُندر پیلے سارس تیر رہے ہیں

ان کے سر پر بادل دیکھ

جھاگ اُڑاتی موجوں کی پُورب کے تٹ پر ہلچل دیکھ

تاؤ چودھری کہاں گیا ہے، کون پتا بتلائے گا

دیس میں شاید آلوچوں کی کلیوں کے وہ جائے گا

فصل نئ اُگائے گا۔ ظالم ہاتھ زمینداروں کے کوڑے جب لہراتے تھے

ہاں اس جنم بھوم میں بیری، کیا کیا ظلم کماتے تھے

لال پھریرے آن جگایا محنت کش دہقانوں کو

قربانی نے نیا ارادہ بخشا سوختہ جانوں کو

آج انہی نے سورج چاند سے انبر نئے بسائے ہیں

دیہاتوں میں دھان اور مکّا کھیت لہرائے ہیں

پیلی شام کی دھند کے اندر

گھر کو لوٹنے والے جری جوانوں ہی کے سائے ہیں

(یہ نو ندیاں دریائے یانگسی کی شاخیں ہیں۔ تاؤ چودھری (تاؤ یوان ینگ ۳۶۵ء تا ۴۲۷ء) ایک دہقانی شاعر تھا اور علاقے کا عہدے دار۔ عہدیداری اس نے تج دی اور جوگ لے لیا)

جب انقلابی قوتوں نے نانکنگ آزاد کرایا

چنگ شان کو آج اک بپھرے طوفاں نے آگھیرا ہے

فوج نے اپنی دریا کے اس پار اتارا ڈیرا ہے

دیکھو دیکھو شہر کو دیکھو

بیٹھا باگھ مچلتا ناگ

عظمتِ رفتہ جس نے اپنی پالی ہے بلکہ اور بڑھالی ہے

دھرتی انبر فتح کا ڈنکا سن کر کیسے دہلے ہیں

اے بلوانو۔ ہم کو کچی شہرت نہیں کمانا ہے

بھاگنے والے دشمن کا اب نام ونشان مٹانا ہے

قدرت بھی گر جاندار ہو، اس کا جوبن ڈھل جائے

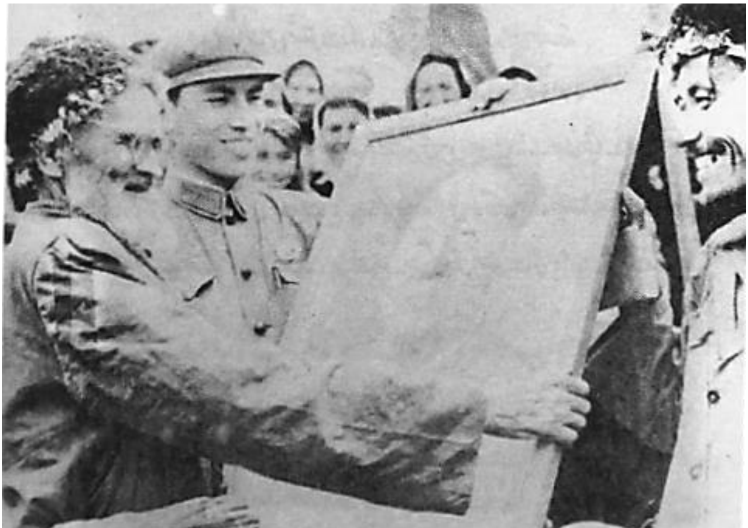
لیکن انسان کی دنیا میں

سا گر بھی شہتوت کی باڑی بن جائے اور پھل جائے

اپریل ۱۹۴۹ء

(چنگ شان پہاڑی ہے نانکنگ کے مشرق میں اور چیانگ کائی شیک کا دار الحکومت تھا۔ شہتوت کی باڑی کی حکایت یہ ہے کہ ایک چینی خاتون نے ایک زمانے میں اتنی عمر پالی کہ اس نے سمندروں کو خشک ہوتے اور ان کی جگہ شہتوت کی باڑیاں لہراتے دیکھا)

بابا قربان تولوم کی کہانی



بابا قربان تولوم ماؤزے تنگ کی تصویر کے ساتھ

سنکیانگ تو ہم جا نہ سکے کیونکہ معلوم ہوا رستہ لمبا اور دشوار گزار ہے۔ ہوائی جہاز میں بھی جائیں تو کئی دن لگیں گے۔ ادھر ہمارے وفد کے اکثر لوگ مصروف آدمی تھے۔ اپنے کالجوں، یونیورسٹیوں اور دفتر سے محدود چھٹیاں لے کر آئے تھے۔ یہاں اس کی تلافی کی صورت یوں نکلی کہ ڈاکٹر عالیہ امام نے ہمیں پیکنگ کے سنکیانگ ریستوران میں کھانا کھلایا اور قومیتوں کے محل میں ہم نے سنکیانگ کا ایوان دیکھا اور بی بی رسالت سے باتیں کیں۔

کھانا تو وہی پلاؤ اور کباب وغیرہ تھے جس سے پہلے اقبال اور نذر الاسلام کے بارے میں غالب اینڈ گوئٹے قسم کی تقریریں ہوئیں اور ہمارا کلام بھی سُنایا گیا جس میں ہم پر دو سانحے گزرے۔ ایک تو یہ کہ ہم نے اپنی طرف سے اپنی اچھی اچھی آسان آسان غزلیں پڑھیں، لیکن کسی نے ایک حرف داد کا نہ دیا۔ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے، دوسرے یہ کہ جب ہم تھک ہار کے اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے تو ایک پاکستانی بی بی نے از راہِ اخلاق ہماری طرف جھک کر پوچھا کہ "یہ غزلیں جو آپ نے پڑھیں، آپ کی اپنی تھیں؟ کیا آپ شعر کہتے ہیں؟"

قومیتوں کا محل ہمارے ہوٹل کے ساتھ ہی ملا ہوا تھا جس کا نام قومیتوں کا ہوٹل ہے۔ چین میں کوئی باون قومیتیں ہیں۔ اصل چینی قوم ہان کہلاتی ہے اور انھی کی

زبان دنیا میں چینی زبان مشہور ہے۔ ہان کے علاوہ جو قومیتیں یا اقلیتیں ہیں وہ آبادی میں تو چھ فی صد سے زیادہ نہیں لیکن چین کے ساٹھ فیصد رقبے پر چھائی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی مسلمان ہیں بلکہ خود ہان قوم میں بھی مسلمان ہیں جو ہُوئی کہلاتے ہیں۔ سنکیانگ کے مسلمانوں میں سے کچھ تاجک ہیں، کچھ ایغور، کچھ کرغیز، کچھ قزاق اور کچھ ازبک۔ یہ علاقہ چینی ترکستان کہلاتا تھا اور اس کی سرحدیں روسی ترکستان سے ملتی ہیں۔ انہی قومیتوں کے لوگ سرحد کے اس پار بھی رہتے ہیں۔ تقسیم سیاسی اور جغرافیائی ہے۔

قومیتوں کے محل میں تمام یا اکثر اہم اقلیتوں کے لیے ایک ایک ایوان مخصوص ہے جہاں ان کے لباس اور ان کی معاشرت کے نقوش محفوظ ہیں۔ یہیں ان کی تاریخ بھی تصویروں میں رقم ہے اور آج کل کی ترقی کے نقشے ہیں۔ ہمارے پاس وقت زیادہ نہ تھا اس لئے فقط سنکیانگ اور تبت کے ایوان دیکھے۔ اس عمارت کی خوبصورتی اور شکوہ کا ذکر کیا کیجئے۔ یہ بھی ان دس عمارتوں میں سے ہے جو انقلاب کے دسویں برس میں دس ماہ کی مدت میں تعمیر ہوئیں۔ نہایت مُجلّا پتھروں کے فرش اور ستون۔ پہلی منزل پر جا کر دہنے ہاتھ کو پہلا ایوان سنکیانگ کا ہے۔ رسالت نام کی ایک چھوٹی سی لڑکی نے جس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی چھڑی تھی اور جس نے دو چوٹیاں کر

کے شانوں پر ڈال رکھی تھیں، ہمارا خیر مقدم کیا اور اس کے بعد فر فر تقریر شروع کی۔ یہ تقریر اس بارے میں تھی کہ انقلاب سے پہلے مستبد امیروں کے عہد میں وہاں کے عوام کا کیا حال تھا۔ خود تو حرم بنا کر عیش کرتے تھے اور عام لوگوں کو بکریوں کا دودھ بمشکل ملتا تھا۔ زمین کے بھی وہ مالک نہ تھے، رعیت تھے اور تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پیداوار بھی یونہی سی تھی اب وہاں سارے علاقے میں اسکولوں کا جال بچھا ہے۔ کارخانے ہی کارخانے ہیں اور اجتماعی کھیت سونا اگلتے ہیں، پہلے ہم نے سنکیانگ کے ایک گیت کا ذکر کیا ہے :

اے مرے گھوڑے آہستہ

سبزہ زار کے منظر دیکھو

موٹر دیکھ ٹریکٹر دیکھ

باڑیاں کھیت طویلے دیکھ

بجلی کے یہ کھمبے دیکھ

اے مرے گھوڑے آہستہ

اس گیت میں سنکیانگ کے عوام کا احساسِ آزادی اور احساسِ فراغت بسا ہوا ہے۔ پھلوں، فصلوں اور معدنیات کی بہار ہے۔ سنکیانگ کا رقبہ انگلستان، فرانس اور جرمنی کے مجموعی رقبے سے بھی زیادہ ہے اور ارمچی سنکیانگ کا دارالحکومت پیکنگ سے کوئی تین ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ کرمائی کے علاقے میں جو تیل کا مرکز دریافت ہوا ہے وہ چین بھر میں سب سے بڑا ہے۔

بی بی رسالت نے کیا کیا کچھ فرمایا یہ تو ہم بھول گئے۔ ہاں وہاں شیشے کے شوکیس میں انہوں نے کمیونوں کے جو ماڈل بنا رکھے ہیں ان کی سرسبزی اور شادابی اب تک آنکھوں میں ہے۔ رسالت ایک مقامی کالج میں پڑھتی ہیں اور ہاسٹل میں رہتی ہیں۔ اس کے والدین سنکیانگ کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ زبان اور قومیت رسالت کی ایغور ہے جو سنکیانگ کی اکثریتی قومیت ہے۔ بابا قربان تولوم جن کا نام سب جانتے ہیں اور جن کی چیئرمین ماؤزے تنگ سے ملنے کی تمنّا اسّی سال کی عمر میں ۱۹۵۸ء میں پوری ہوئی، اسی قوم سے ہیں۔

ان کی کہانی بھی ایک مثالی کہانی ہے۔ انقلاب کے وقت ان کا اثاثہ کچھ بھی نہ تھا، نہ مکان، نہ زمین، نہ مویشی۔ فقط ایک پھٹا کمبل اور پیتل کی ایک ٹوٹی کیتلی۔ قرض کا بار اس پر مستزاد۔

۱۹۵۶ء کی زرعی اصلاحات میں ان کو کچھ زمین ملی اور ایک مکان رہنے کو، اس کے بعد انہوں نے کچھ لوگوں سے مل کر امدادِ باہمی کی ایک ٹیم بنائی اور یوں ان کی زندگی میں پہلی بار خوشی اور خوشحالی کا عمل دخل ہوا۔ قربان تولوم کو یہ معلوم نہ تھا کہ پیکنگ کتنی دور ہے۔ لیکن چیئرمین ماؤ کی زیارت وہ ضرور کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن تڑکے ہی اس نے اپنی بیوی سے پراٹھے پکوائے اور گدھے پر زین کس کر پیکنگ کی طرف کو روانہ ہوا۔ کوئی پچاس ساٹھ میل گیا ہوگا کہ اسے کچھ لوگ ملے جنہوں نے بتایا کہ پیکنگ تین ہزار میل دور ہے اور گدھا وہاں تک نہیں جا سکتا۔ واپس آ کر انہوں نے کسی سے چیئرمین ماؤ کے نام چٹھی لکھوائی جس کا جواب جلد ہی مل گیا۔ ماؤ صاحب نے اسے اپنی ایک تصویر بھیجی اور خیریت پوچھی۔ قربان تولوم کا حوصلہ بڑھا اور اس نے جابجا امدادِ باہمی کی سوسائیٹیاں بنوائیں اور اجتماعی پیداوار بڑھانے میں حصّہ لیا ۱۹۵۸ء میں اسے ایک مثالی کارکن قرار دیا گیا۔

جون ۱۹۵۸ء میں پیکنگ میں زرعی آلات کی ایک قومی نمائش ہونا تھی۔ خُتن کے علاقے نے جس کو ہم غزالوں کے واسطے سے جانتے ہیں اور جو قربان بابا کی زاد بوم ہے، کچھ کارکنوں کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ کیا اور ان میں قربان صاحب بھی تھے۔ ان کی خوشی کا کچھ نہ پوچھیے۔ انہوں نے کچھ خشک خوبانیاں اور کچھ میوے ایک پوٹلی

میں باندھے اور ایک کپڑا اپنی بی بی کے ہاتھ کا بُنا ہوا اور کڑھا ہوا چیئر مین ماؤ کی نذر کرنے کو ساتھ لیا۔ سفر کا ایک بڑا مرحلہ ریل کا تھا، جہاں کہیں ریل ٹھہرتی یہ کھڑکی سے سر نکال کر بے تابی سے پوچھتے۔ ”کیا پیکنگ آ گیا؟ اُتروں؟“

آخر منزلِ مقصود آئی، قربان صاحب کو چیئر مین ماؤ سے پُر زور مصافحہ کرنے کا موقع ملا۔ قربان نے تحفے نذر کیے جو چیئر مین ماؤ کو بہت پسند آئے۔ واپس آ کر قربان نے پڑھنا سیکھنا اور اب تو اپنے علاقے کی مشہور شخصیت ہے۔ کونسل کا ممبر ہے۔



کینٹن میں ایک اور موقع ہمیں سنکیانگ کے نزدیک ہونے کا ملا۔ وہاں سنکیانگ کے نوجوان رقاصوں اور موسیقاروں کا ایک کلچرل طائفہ آیا ہوا تھا، جنہوں نے سن یات سن میموریل ہال میں اپنے کمال دکھائے۔ ان میں ایک گیت ”تو بنڑے کا

گیت" تھا۔ چینیوں کو خود سمجھنے اور سمجھانے میں دقّت پیش آرہی تھی کہ توبنڑہ کیا ہوتا ہے۔ آخر ہم نے کہا چپ رہو ہمیں معلوم ہے یہی اپنا تونبہ تھا (تونبہ بجدائی نا۔۔ تار بنا)۔ ایک گیت کا عنوان تھا "سمندر میں سفر کرتے وقت قطب نما ضروری ہے۔" ایک اور طوفان میں بھٹکی ہوئی بھیڑوں کے نام سے تھا۔ خوبصورت منقّش ٹوپیاں اور آئینہ جڑے لمبے لمبے ڈھیلے ڈھالے لباس پہنے لڑکیاں پریاں معلوم ہوتی تھیں۔ پروگرام کے اختتام پر ہماری ان سے ملاقات کا انتظام ہوا۔ پہلے تو وہ السلامُ علیکم سن کر بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد چینی مترجم نے تعارف شروع کرایا۔ پرنسپل ابراہیم خان کا نام چینی لہجے میں کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ابراہیم خاں۔۔۔۔" سب نے اسے دہرایا۔ پھر جسیم الدّین تھے۔ یہ بھی ان کی سمجھ میں آگیا۔ اور ہم نے لفظ "شاعر" کا پیوند لگایا تو سب نے تالیاں بجائیں۔ اس پر ہماری سمجھ میں آیا کہ ئی لفظ مشترک ہے۔ ہم کوئی مین میکھ نکالنے تو گئے نہیں تھے لہٰذا اس کے بعد بھی سب کے ناموں کے ساتھ شاعر لگاتے گئے۔ ان میں سے ایسے بھی تھے کہ شعر موزوں نہیں پڑھ سکتے لیکن بڑی خوشی سے داد وصول کرتے گئے۔ البتہ پیر حسام الدّین راشدی نے جن کا نام سب سے آخر میں آیا۔ بڑے زوروں سے انکار کیا اور دونوں ہاتھ ملا کر کہنے لگے "میں

شاعر نہیں ہوں، میں شاعر نہیں ہوں۔"

وہ دکان اپنی بڑھا گئے

ٹوکیو میں ہمیں اپنے ہوٹل کے کاؤنٹر سے ایک کتابچہ ملا ''ٹوکیو، نائٹ لائف اینڈ شاپنگ'' اس شہر غدّار کی دن کی زندگی کم اور رات کی زندگی زیادہ مشہور ہے۔ کوئی سال بھر ہوا رسالہ ٹائم نے لکھا تھا کہ وہاں کے نائٹ کلبوں میں اتنی بھیڑ بھاڑ رہتی ہے کہ بے چاری میزبانوں کو بیٹھنے کی اور کوئی جگہ میسر نہیں آتی سوائے معزز مہمانوں کی گود کے۔۔۔ خیر کھولا تو پہلا ہی باب تھا Comments For Single Men یعنی ہدایت نامہ مجرّدین۔ مضمون کا قیاس آپ خود کر لیجئے۔ اس کی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ اتفاق سے اسی روز ہمیں ٹوکیو سے باہر نکو جانا تھا۔ رستے میں ریل میں اپنے ایک میزبان تھے جو جنگ سے قبل اٹلی میں جاپان کا سفیر رہ چکا

تھا۔ عرض کیا کہ "دیکھئے یہ کتابچہ ایک امریکن نے چھاپ رکھا ہے اور ضبط ہونا کیا معنی آپ کے سب ہوٹلوں کے کاؤنٹروں سے ملتا ہے۔ اس میں جاپان کی عورتوں کے متعلق کیا اناپ شناپ لکھا ہے کہ بار کی مینجر یاماماسان کو باہر لے جانے کی فیس دیجئے اور پھر اپنی میزبان بار گرل یا کیبرے گرل کو کہیں بھی سکون اور تنہائی کی جگہ پر لے جایئے اور اس سے فلسفے کی بحث کیجئے۔ جاپانی مردوں کو بھی نہیں معاف کیا۔ لکھا ہے کہ سخت لیچڑ ہوتے ہیں۔ اچھی اچھی لڑکیاں اپنے لیے رکھنا جانتے ہیں لیکن آپ یہ کیجئے، یہ نہ ہو تو یہ ترکیب نمبر ۲ آزمایئے وغیرہ۔۔۔ معلوم ہوتا ہے جاپانی ان کتابچوں کو نہیں پڑھتے۔ ہمارے ہاں تو ذرا اخباروں میں احتجاج ہو اور پابندی لگ جائے۔"

وہ صاحب چپ بیٹھے سنتے رہے۔ پھر بولے "اجی کیا ہوتا ہے ان باتوں سے، ہم پابندیوں کے قائل نہیں۔"

ہم نے شرمندہ ہو کر کتابچہ تہہ کیا اور جیب میں رکھا۔ اب ہانگ کانگ کی سُنئے ٹوکیو سے وہاں پہنچ کر اپنے ہوٹل میں نہا دھو کپڑے بدل کر سڑک پر نکلے ہی تھے کہ ایک ذات تشریف نے روکا۔

"کیا بات ہے؟" ہم نے پُوچھا۔

بولا "چوکری چہیے؟"

ہم نے کہا "ہم چینی نہیں جانتے، انگریزی بولو"

کہنے لگا "میں چینی نہیں ہندوستانی بول رہا ہوں۔ سستا چوکری جوان چوکری۔"

ظالموں نے اس برِ عظیم کے ان پڑھوں کو پھانسنے کے لیے چھوکری کا لفظ یاد کر رکھا ہے۔ ہم نے کہا۔ "ہت ترے کی، بھاگ۔" لیکن اس سے دور قدم پر ایک سائیکل رکشا والے نے، اس سے ذرا آگے ایک اور بے فکرے نے رستہ روکا۔ مضمون وہی۔ آخر میں خود وہاں سے بھاگنا پڑا۔

ادھر ہوٹل میں دیکھا کہ ٹیلی فون کے برابر ہی تختی لگی ہے کہ ہمارے کرم فرماؤں کو بہت سے غیر متعلق اور ناشائستہ لوگ فون پر بنفسِ نفیس آکر تنگ کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم بارہ بجے کے بعد کوئی ایسا فون ملائیں گے نہ کسی کو آنے دیں گے تاآنکہ ہمارے کرم فرما ہمیں اس کے برعکس ہدایت نہ کریں۔ چین میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

سارے چین میں ایک ہی جسم فروش نہیں۔ ایک بھی قحبہ خانہ نہیں۔ ایک بھی نائٹ کلب نہیں۔ کوئی فلم خاص برائے بالغاں نہیں۔ دہی دہانوی کے ناول تک نہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ جیسے گئے ہیں ویسے ہی پھر کے آ جائیے۔ یوں آپ کا جی للچانے کے مواقع بھی زیادہ نہیں۔ لباس تک میں زہد شکنی کا کوئی عنصر نہیں۔ عریانی تو ایک طرف بغیر آستین کا چست لباس بھی نہ ملے گا اور نہ ٹخنوں سے اوپر کسی عورت کی ٹانگ نظر آئے گی۔ بدکاری شوق کی کم معاشی ضرورت کی زیادہ ہوتی ہے سو وہ کسی کو نہیں۔ سب کھاتے کماتے ہیں۔ شادی کی منزل آئی تو رفیقِ زندگی مل جائے گا۔ تفریح کی حاجت ہے تو تھیٹر جائیے، سینما جائیے، کلچرل پیلس جائیے۔ کچھ کھیلئے۔ لوگوں کو کرتب کرتے دیکھئے۔ گھر آ کر سو جائیے۔ ہمارے ایک رومانی طبیعت کے ساتھی نے تنگ آ کر کہا۔ "چین بڑا بور ملک ہے جی۔"

یہ بات انقلاب سے پہلے نہ تھی۔ انقلاب سے پہلے کا شنگھائی سینۂ چین کا ناسور کہلاتا تھا۔ چوری، ڈکیتی، قتل و غارت، سمگلنگ کا تو اڈّہ تھا ہی قحبہ خانوں کے لیے بھی دنیا بھر میں مشہور تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ وہاں ہفتے منانے کا دستور نہیں کہ ایک ہفتے کے لیے گداگروں کو محتاج گھر لے گئے اور چند دن میں وہ پھر کشکول بدست مصنوعی زخموں پر مکھیاں بھنکاتے واپس آ گئے۔ نہ اِکّا

دُ کّا دعوتِ گناہ دینے والوں کو پکڑنے کی خبریں سُننے میں آتی ہیں۔ چین میں جسم فروشی کو ایک معاشرتی روگ یا مجبوری جان کر اس کا علاج کیا گیا۔ محتاجوں کو شہروں سے نکال کر قصبوں اور دیہات میں منتشر کر دیا گیا جہاں ان کے ماضی کے ذکر سے شرمندہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ان کی نفسیات اور زندگی بھر کی عادات کو دیکھتے ہوئے ایسے کارخانوں میں تعین کیا گیا جہاں شام سے صبح تک کام ہوتا ہے اور دن میں لوگ آرام کرتے ہیں۔ پھر اُن کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے زندگی کے رفیق ڈھونڈ لیے اور یوں معاشرے کا کار آمد اور صحت مند جزو بن گئیں۔ البتہ ان کا شوق لاعلاج تھا۔ بالخصوص اس کاروبار پر پلنے والے۔ انہوں نے نئے چین سے کنارا کیا اور ہانگ کانگ میں آ کر دکانیں بسالیں اور آتے ہی بیان دیا کہ نئے چین میں آزادی نہیں۔ جبر کا دور دورہ ہے اس لیے ہم آزاد دنیا میں سانس لینے کو یہاں آ گئے ہیں۔ ہمارے کرم فرما کارِلائقہ سے یاد فرمائیں۔

چین میں بے شمار غیر ملکی جاتے ہیں یا بطور طالبِ علم رہتے ہیں۔ چند دن میں ان کو اس ملک کا مزاج معلوم ہو جاتا ہے۔ چینیوں کے جنسی بے راہ روی کے معاملے میں اتنے متشدّد ہونے کی ایک بڑی وجہ حِفظِ نفس ہے، قومی خود داری ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہم اتنے دنوں نکبت و افلاس کا شکار رہے ہیں کہ ہماری عزّت، ہماری

عزّت نہیں رہی تھی۔ اب ہم بیدار ہوئے ہیں تو یہ کچھ نہ ہونے دیں گے۔ اب ہماری بہنوں بیٹیوں کی طرف کوئی نظر اُٹھاکر نہ دیکھ سکے گا۔ چینیوں کو اپنے ایشیائی اور افریقی دوستوں کی اتنی خاطر منظور رہتی ہے۔ اس کے باوجود فلیکس گرین بیان کرتا ہے کہ ایک افریقی طالبِ علم نے ایک چینی لڑکی سے جو بس کنڈکٹر تھی، دلچسپی لینی شروع کر دی۔ وہ بس شاپ پر کھڑا تھا اور فقط اسی کی بس میں سوار ہوتا اور اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔ ایک روز اس نے اس سے کہا کہ میں فلاں جگہ رہتا ہوں۔ ڈیوٹی ختم ہو تو "پیتم آن ملو" وہ تو خیر نہ آئی لیکن دوسرے روز ایک خط اس کو موصول ہوا کہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر آپ کو وطن واپس چلا جانا ضروری ہے۔ وظیفہ آپ کا منسوخ، ٹکٹ آپ کا تیار ہے۔

کہا جاتا ہے کہ روسیوں سے بگاڑ کی تہہ میں بھی چینیوں کا حفظِ نفس کا حد سے بڑھا ہوا احساس تھا۔ روسی اپنے کمیونسٹ حلیف کی مدد کرنے کے لیے آئے تھے لیکن وہ مارکس کو تو جیسا کچھ سمجھ سکتے تھے، سمجھتے تھے، چینی مزاج کو نہ سمجھے۔ انہوں نے خود کو چینیوں سے ارفع کوئی چیز سمجھنا شروع کر دیا اور اس کا اپنے رویے سے اظہار کئے بنا نہ رہ سکے۔ حتیٰ کہ ایک روز چینیوں کو کہنا پڑا کہ نماز ہو چکی مصلّے اُٹھائیے۔ یہ رہے آپ کے ٹکٹ۔ اس وقت بے شمار منصوبے ادھورے تھے۔ بہت سے

کارخانوں کا سامان آدھا پونا تھا اور چینیوں کا کہنا ہے کہ روسی جاتے جاتے کارخانوں اور منصوبوں کے خاکے (بلیو پرنٹ) بھی ساتھ لے گئے۔ اس بڑھیا کی طرح جو گاؤں سے ناخوش ہو کر اپنا مرغ بغل میں داب کر چلی گئی تھی کہ دیکھیں تو اب یہ لوگ کیسے صبح کو اُٹھتے ہیں۔ نہ مِرا مرغ ہو گا نہ وہ بانگ دے گا نہ صبح ہو گی۔

پانی اور طبیعت دونوں کا اصول ہے کہ روکیے تو اور رواں ہوتی ہے، بپھرتی ہے۔ شنگھائی میں ہم نے جو بھاری مشینوں کا کارخانہ دیکھا وہ اس قسم کی منتقمانہ کارروائی سمجھیے۔ ہم تو خیر ٹیکنیکل آدمی نہ تھے۔ فلک بوس اور دیو ہیکل مشینیں چین میں پہلے بھی دیکھ چکے تھے لیکن معلوم ہوا کہ ایک خاص مشین دباؤ دینے والے ہائیڈرالک پریس کو دیکھنے کے لیے فرانس، سکینڈے نیویا اور برطانیہ سے بھی انجنیئر اور صحافی آئے ہوئے ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ آخر کیا خاص بات ہے اس میں؟ معلوم ہوا کہ اتنی بڑی قوّت یعنی ۱۶ ہزار ٹن کا دباؤ دینے والے پریس فقط دنیا کے آٹھ ملکوں میں ہیں۔ اور فقط پانچ ملک ان کے بنانے پر قادر ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی اور چین۔۔۔ چینی انجنیئروں نے یہ پریس اپنی محنت اور ذہانت سے بنایا ہے۔ ان میں سے فقط ایک کو بیرون ملک چیکوسلواکیہ میں اسے سرسری طور پر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ نتیجتاً ڈیڑھ سال اس کی ریسرچ اور ڈیزائننگ میں لگا اور ڈیڑھ سال بنانے میں۔

دقّتیں بہت تھیں۔ اتنا بڑا اخراد ان کے پاس نہ تھا۔ کرینیں فقط ۶۷ ٹن اُٹھانے والی تھیں اور یہاں ۲۰۰ ٹن اُٹھانے والی چاہیں تھیں۔ بہر حال اب جو بن گیا ہے تو دوسرے ملکوں کے پریسوں سے قوی تر ہے کیونکہ ان کے دباؤ دینے کی انتہائی قوت جو بالعموم استعمال نہیں کی جاتی لیکن کبھی ضرورت پڑ بھی جاتی ہے۔ پندرہ ہزار ٹن ہے لیکن اس پریس کی سولہ ہزار ٹن ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ روس کے پاس ایسا پریس نہیں ہے۔

وہاں کے ادیبوں کو خاص طور پر روس کے معاملے میں شمشیر برہنہ پایا۔ ووہان میں ایک بڑے جغادری ادیب ملے جو تین بار روس ہو آئے تھے۔ وہ بولے جناب اگر کوئی غیر کمیونسٹ ہے تو ٹھیک ہے۔ آپ لوگ بھی غیر کمیونسٹ ہیں۔ آپ سے ہمیں تعرض نہیں۔ آپ لوگ کم از کم کمیونزم کو خراب تو نہیں کرتے۔ اس میں تحریف کر کے لوگوں کو گمراہ تو نہیں کرتے۔ روس کے ادیبوں کی کتابوں کے مندرجات کو تو جانے دیجئے۔ ان کی گفتگو فرصت میں ہو گی۔ ایلیا اہرن برگ سے پوچھا گیا کہ آپ آج کل لکھتے کیوں نہیں۔ بولا مجھے کیا ضرورت ہے لکھنے کی۔ میرے پاس رائلٹی کے کوئی دو کروڑ روبل ہیں۔ وہی ختم نہیں ہوں گے۔ شوفوخوف صاحب کا گھر بھی دیکھا۔ ایک نہیں تین تین جنہیں محل، بنگلے، کوٹھیاں کہہ لیجئے۔ جب کہ

بہتوں کو دو کمرے کے مکان بھی مشکل سے میسر ہوتے ہیں۔ پڑے اینڈتے ہیں۔ کاریں ہیں اور ایک ذاتی ہوائی جہاز بھی۔ بیسیوں نوکر مٹھی چاپی کرنے کو ہیں۔ کیونکہ لاکھوں کی رائلٹی آتی ہے۔ ابھی کل ہی ٹوکیو میں جہاں وہ استراحت فرمارہے ہیں، ان سے کسی نوجوان مصنّف نے آشیر واد مانگی تو بولے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ کسی لکھ پتی کی لڑکی سے شادی کرو تاکہ دلجمعی سے لکھ لکھا سکو۔ بھلا ایسے ہوتے ہیں کمیونسٹ، ان میں اور جاگیر داری دور کے کسی رئیس میں کیا فرق ہے؟ سرخ محافظوں کی تحریک اس زمانے میں تو شروع نہ ہوئی تھی جب ہم چین میں تھے لیکن ہمارے جو دوست اس کے بعد وہاں ہو کر آئے ہیں۔ شوکت صدیقی اور اشفاق احمد وغیرہ، ان کا بیان ہے کہ یہ تحریک اس قسم کے بیانات کے خلاف ہے جو سرمایہ داری کی طرف واپسی کا راستہ کھولتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دیکھو روس سے چوری حتیٰ کہ جنسی بے راہ روی کی اتنی خبریں آرہی ہیں۔ اس سے بعض طبقے انجنیئر، سائنٹسٹ، مصنّف وغیرہ جن کی یافت زیادہ ہے خود کو اللہ کے برگزیدہ بندے اور عوام النّاس سے بہتر سمجھنے لگے ہیں۔ اس کے برعکس چین میں باہمی آمدنی کا فرق بتدریج کم کیا جارہا ہے۔ پہلے اوپر کی حد سات سو آٹھ سو یوان تھی۔ اب ساڑھے تین سو پر آگئی ہے۔ نیچے کی حد پچاس سے بڑھ کر سو ہو گئی ہے۔ فقط وہ لوگ جو

طالبِ علم بھی ہیں، اور کام بھی کرتے ہیں اس سے کم پاتے ہیں۔ کوئی دن میں نیچے کی حد اوپر کی حد سے جا ملے گی اور اس کے بعد پوری قوم کی محنت پوری قوم کی ہم سطح خوشحالی کے کام آئے گی۔

چین میں مصنّفوں کو رائلٹی ان کی کتابوں کی اشاعت کے حساب سے ملا کرتی تھی جو بعض صورتوں میں بہت ہو جاتی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں اس کی حد مقرر کر دی گئی۔ اب فقط کتاب کے پہلے ایڈیشن پر مقررہ رائلٹی ملتی ہے۔ اس پر ہماری اپنی چینی دوستوں سے بہت بحث رہی۔ ہم بطور شاعر اور ادیب کے سوچتے تھے، وہ چینی قوم کے ایک فرد کے۔ ان کا کہنا تھا کہ روپے کے علاوہ بھی دنیا میں ایسی قدریں ہیں جن کے لیے انسان محنت کرتا ہے، لکھتا ہے۔ یہ بات پہلے تو ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ پھر جو ساری قوم کا یہ رنگ دیکھا تو آگئی۔ اسے کہتے ہیں:

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو

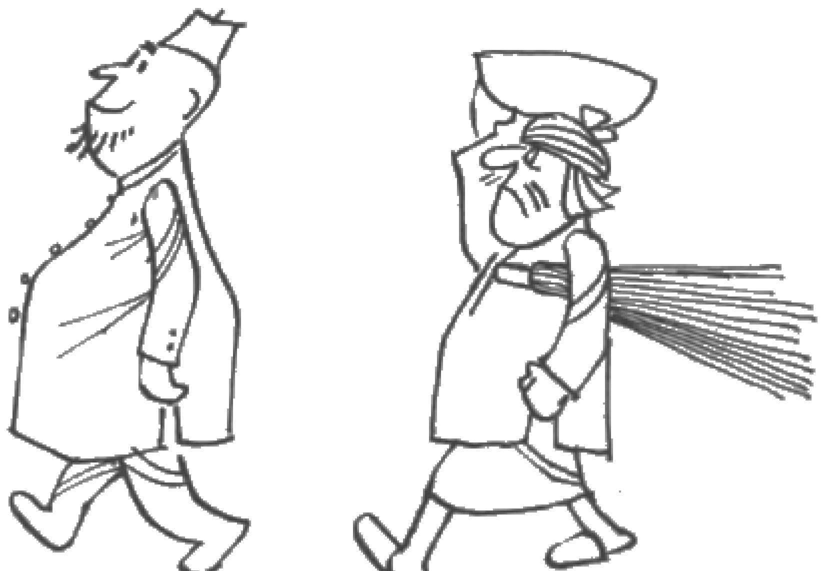
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

ہر قسم کی صفائی ہے، سوائے ہاتھ کی صفائی کے

پیکنگ کی سڑکوں پر جب پہلے پہل ہمیں ایسے لوگ نظر آئے جنھوں نے اپنے منہ اور ناک پر سفید کپڑے کے ماسک چڑھا رکھے تھے تو ہمیں شبہ ہوا کہ یہ لوگ جین مت کے پیرو ہیں۔ جینیوں کا ایک طبقہ ایسا ہم نے دیکھا ہے جو منہ پر کپڑے کی پٹی باندھے رکھتا ہے تاکہ ان کے سانس کی آمد و شد سے ان کیڑوں اور جراثیم کو جسمانی گزند نہ پہنچے جو فضا میں موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں یہ بات نہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ یہ احتیاط کر رہے ہیں کہ ان کا زکام دوسرے کو نہ لگ جائے۔ لیکن زیادہ تر بطور احتیاط ایسا کرتے ہیں کہ باہر کے گرد و غبار اور جراثیم کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ وہاں کے ہسپتال میں ہم نے اشتیاق ظاہر کیا تو ایک ایک ماسک

ہمیں اور اعجاز بٹالوی کو بھی عنایت ہوا۔ ہمیں تو راس نہ آیا۔ اعجاز صاحب دو دن تک منہ باندھتے پھرتے رہے۔ ان کا عمل کم از کم ہمارے لیے فائدے سے خالی نہ تھا کیونکہ وہ عموماً کم گوئی سے احتراز کرتے ہیں اور اپنے پیشے وکالت سے مجبور سیدھی سادھی بات کو بھی دلائل اور براہین سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اور لوگ منہ کھولتے تھے تو گفتگو کرتے تھے، اعجاز صاحب تقریر۔ ان دو دنوں میں ہمارے اعصاب کو خاصہ سکون رہا۔ صحت کا خیال چینیوں کو اس حد تک رہتا ہے کہ وحشت ہوتی ہے۔ ہم ایسے آرام طلبوں کا تو وہاں جینا حرام ہو جائے۔ ورزش ہر کوئی ہر روز کرتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ڈھاکے کے رہنے والے سڑکوں پر اتنا تھوکتے ہیں کہ ڈھاکہ میونسپلٹی کو ایک الگ داروغہ صفائی رکھنا پڑا ہے۔ جہاں یہ جاتے ہیں، وہ سی آئی ڈی کی طرح ان کے پیچھے پیچھے رہتا ہے۔ ان کو وہاں بڑی تکلیف ہوئی کہ یہاں یہ رواج نہیں۔ نہ اجازت ہے۔ پانی ابال کر پیتے ہیں۔ موبل آئل وہاں گاڑیوں میں ڈالا جاتا ہے، اصلی یا بناسپتی گھی کہہ کر فروخت نہیں کیا جاتا۔ بھٹے کی اینٹیں بھی مکان بنانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ ہلدی اور مرچ میں ملا کر ان سے تعمیرِ معدہ کا کام نہیں لیا جاتا۔ وہاں دودھ بھی گائیوں بھینسوں کا ہوتا ہے۔ تالابوں یا کمیٹی کے نلکوں سے حاصل نہیں کیا جاتا۔ پھر محنت ہر کوئی کرتا ہے۔ لہٰذا

سارے چین میں ہم ایسے کسی شخص کی تلاش میں رہے جو بڑی نہ سہی چھوٹی موٹی توند ہی کا مالک ہو۔ سوچو کے ہوٹل میں ہم نے کچھ چینی توندوں والے دیکھے تو خوش ہوئے اور وطنِ عزیز کی یاد آئی لیکن معلوم ہوا وہ یہاں کے نہیں، سنگا پور سے بغرضِ تفریح آئے ہوئے ہیں۔ لاغر آدمی بھی چین میں کوئی نظر نہ آیا۔ واپسی پر ہمارے ایک امریکن دوست نے اس کی یہ توجیہ کی کہ جب کوئی غیر ملکی آتا ہے تو ڈھنڈورا پیٹ جاتا ہے کہ لاغر لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جائیں اور اندر سے کنڈیاں چڑھالیں تاکہ غیر ملکی لوگ متاثر ہو جائیں۔



ہم نے کہا وہاں تو کوئی ایسا وقت نہیں آتا کہ غیر ملکیوں کے غول نہ گھومتے پھریں اور کئی بار تو وہ بلا اطلاع بھی دیہات اور کھیتوں، کارخانوں اور گلیوں میں جا نکلتے ہیں۔ چینیوں کو بہت تکلیف ہوتی ہو گی۔ وہ صاحب بولے۔ خیر آپ یقین نہیں کرتے، نہ سہی میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے۔

چین میں ہمارے لیے ایک پریشانی یہ تھی کہ جہاں کہیں ذرا سا کھانسے یا چھینکے، ہمارے مہمانوں نے ٹیلی فون اٹھایا کہ بلائیں ڈاکٹر کو۔ ان کی منّت سماجت کر کے منع کرنا پڑتا تھا اور بعض اوقات تو کوئی تکلیف واقعی ہو تو بھی چھپانا پڑتا تھا۔ سیّد وقار عظیم یہاں سے کچھ علیل گئے تھے، کچھ دیوارِ چین کی سردی سے صاحبِ فراش ہو گئے۔ ان کا مرض خاص ہے اور خاص خاص دوائیں ان کو راس آتی ہیں۔ لٰہذا وہ شنگھائی سے قبل از وقت واپس آنا چاہتے تھے۔ اِدھر چینیوں کا خیال تھا کہ ہمارے ہاں سے کوئی شخص تندرست واپس نہ گیا تو ہماری بدنامی ہو گی۔ انہوں نے کئی ڈاکٹر ان پر لگا دیے۔ پیٹنٹ دوائیں تک ہانگ کانگ سے منگا کر دینے کو تیار تھے لیکن وقار صاحب کا اصرار اور ہمارا اپنا یہ خیال تھا کہ ان کا واپس جانا بہتر ہے۔ میں چونکہ ادیبوں کے وفد کا سیکریٹری بھی تھا اس لیے جانتا ہوں کہ چینیوں نے ان کو وہاں روکنے کے لیے کیا کیا جتن کئے۔ بس ماؤزے تنگ سے صدر ایوب کے نام تار دلوانی

رہ گئی۔ ورنہ کون سی سفارش ہے، جو اس کے لیے انہوں نے استعمال نہ کی۔ ووہان میں ہمارے ہسپتال جانے کی تقریب یہ تھی کہ وہاں ہمیں کچھ فلو کا اثر معلوم ہوا۔ کم از کم زکام ضرور تھا۔ دیکھا کر ڈاکٹر پر ڈاکٹر چلا آ رہا ہے۔ پھر اطلاع ملی کہ ہسپتال کا سربراہ تم سے ملاقات کا متمنّی ہے۔ آخر ہم نے کہا بابا ہم خود چلے جاتے ہیں ہسپتال۔ وہاں گئے تو انہوں نے ہمارے اعضائے رئیسہ و غیر رئیسہ آنکھ، کان، ٹانگ وغیرہ سب دیکھ ڈالے۔ دراصل اسی باعث ہم وہاں جانے سے کتراتے تھے اور خود کو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے کہ باقی سب لوگ وطن سدھاریں گے۔ ہم میں داخل دفتر ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ فارما کوپیا میں شاید ہی کوئی مرض ہو گا جو ہم میں نہ ہو گا۔ خیر ہسپتال تو ہم داخل ہو کر نہ دیے۔ دوا ضرور لے آئے اور ابھی استعمال بھی نہ کی تھی کہ تندرست ہو گئے۔

یہ ہسپتال ساڑھے سات سو بیڈ کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جرمن زبان میں سات سال تک ڈاکٹری پڑھی تھی اور بیس سال سے پریکٹس کر رہے تھے۔ ہمارے جی میں آئی کہ ان سے پوچھیں کہ آپ کینیڈا کیوں نہیں چلے جاتے۔ وہاں ڈاکٹروں کو زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ یہ سوال پوچھا تو نہیں لیکن جی اس لیے چاہا کہ ہم خود کتنے ڈاکٹروں کو جانتے ہیں جو تنخواہ اور آمدنی کے لیے وطنِ عزیز چھوڑ کر کینیڈا، امریکہ اور برطانیہ

میں پریکٹس کر رہے ہیں اور ہمارے ہاں آدھی موتیں بروقت ڈاکٹر میسر نہ آنے سے ہوتی ہیں۔ ان سے پوچھئے تو کہتے ہیں کہ ہاں وطن کی خدمت کرنے میں اعتراض نہیں لیکن یہاں ہماری قدر نہیں۔ ہمیں سر آنکھوں پر نہیں بٹھایا جاتا۔ اس پر ہمیں اس چینی ادیب کی یہ بات یاد آئی کہ تنخواہ اور آمدنی کے علاوہ بھی کچھ قدریں ہیں جن کے لیے آدمی کام کرتا ہے اور جہاں سوزی برتتا ہے۔ ایسے ڈاکٹروں، انجنیئروں اور دوسرے ماہروں کی تعداد سینکڑوں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے جو امریکہ اور یورپ کے ملکوں سے آرام اور تموّل کی زندگی چھوڑ کر واپس آئے اور اب معمولی کپڑوں میں معمولی تنخواہ لے کر معمولی مکانوں میں رہتے ہیں لیکن خوش ہیں۔ یہاں ڈاکٹروں کے لیے چند سال سرکاری خدمت لازم قرار دی گئی تھی تو کہرام مچ گیا تھا اور دیہات میں جانے کے نام سے تو ہر کوئی کان پر ہاتھ رکھتا تھا۔ وہاں دیہات کو بھی ملک کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور دیہاتی انسانوں میں شمار ہوتے ہیں جن کا پانی، بجلی، تعلیم، صحت، تفریح، تہذیب سب پر حق ہے۔ انٹلکچول کہلانے والے طبقے کے لوگوں۔ ادیبوں، پروفیسروں، ڈاکٹروں وغیرہ کو سال میں دو مہینے جا کر دیہات میں دیہاتوں کے ساتھ ان کے مکانوں میں رہنا پڑتا ہے اور اسی کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں اور کارخانوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اثر ہے کہ یہ لوگ

خود کو کوئی علیحدہ آسمانی مخلوق نہیں گردانتے۔ اور اس قاعدے سے صدر ماؤزے تنگ تک مستثنیٰ نہیں ہیں۔

اوپر ہم نے سنگاپور کے چینیوں کا ذکر کیا ہے یہ لوگ OVERSEAS یعنی سمندر پار کے چینی کہلاتے ہیں اور ان کے لیے ہوٹل اور کلب وغیرہ بھی ہیں۔ یہ لوگ سنگا پور ہی نہیں ایشیا اور یورپ کے سبھی ملکوں سے آتے ہیں۔ سوچو میں ہمیں جو حضرات ملے یہ لکھ پتی قسم کے تھے۔ اور تین ماہ سے اقصائے چین میں سیر کرتے پھرتے تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ کا تاثر کیا ہے؟ آپ لوگ کیوں یہاں آئے؟ ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ ہمارے دادا یہاں سے بھوکے مرتے قلی بھرتی ہو کر ملایا گئے تھے۔ وہاں انہوں نے رفتہ رفتہ ترقی کی۔ ہماری پیدائش اور پرورش سب وہیں کی ہے۔ اب ہم نے سنا کہ ہمارا آبائی ملک جہاں سے ہمارے اجداد کو بھوک نے بھگایا تھا اتنی ترقی کر گیا ہے اتنا خوشحال اور طاقتور ہو گیا ہے تو جی چاہا کہ جا کر دیکھیں اور واقعی ہم بہت خوش ہیں۔ اکثر لوگ تو گھوم پھر کر واپس چلے جاتے ہی لیکن بہت سے ٹھہر بھی جاتے ہیں۔ جس سائنسدان کے سر چین کے ایٹم بم کی تیاری کا سہرا باندھا جاتا ہے وہ بھی امریکہ سے واپس گیا تھا اور امریکہ میں ایک بہت اونچے سائنسی ادارے میں بڑی ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ صحت میں علاج کی سہولتیں

اور ورزش و محنت کے علاوہ کچھ دخل خوراک کو بھی ہے۔ چینی روغن جوش نہیں کھاتے، سادہ خوراک کھاتے ہیں۔ یہ رواج ہمارے ہاں کا ہے کہ جب تک کسی چیز کے تمام اجزاء کو جن میں وٹامن یا دوسری غذائیتیں ہونے کا خطرہ ہے، پوری طرح ضائع نہ کر دیا جائے مزا نہیں آتا۔ خیر اس مسئلے پر ہم زیادہ زور نہیں دینا چاہتے کیونکہ بہت سے ڈاکٹر حکیم ہمارے حلقۂ احباب میں ہیں۔ ان کی خوشحالی پر آنچ آنے سے ہم خوش نہ ہوں گے تاہم گھروں کی اور کوچہ و بازار کی صفائی ہمیں بھی پسند ہے۔ یہاں کسی کو اپنے گھر یا گلی میں جھاڑو دینے میں عذر نہیں۔ ریل گاڑی تک کی دھلائی ہر روز ہوتی ہے۔ یہ حال تو مادی اور ظاہری صفائی کا ہے۔ ان کی اخلاقی صفائی اور پاکیزگی کا کچھ ذکر ہم گزشتہ باب میں کر چکے ہیں جو مغرب کی تمام آلائشوں اور جنس کے مظاہرے دور رہنے سے پیدا ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ سب خرابیوں کی جڑ زر کی فراوانی یا اسباب تموّل کی ہوس ہے اور یہ ہوس تب پیدا ہوتی ہے جب ہم اپنے ہمسائے کو دیکھتے ہیں کہ اس کے ہاں کار اور ریفریجریٹر آگئے ہیں، میرے پاس کیوں نہیں۔ خواہ مجھے اس کے لیے رشوت یا بے ایمانی کیوں نہ کرنی پڑے۔ چین میں شاید ہی کوئی گھر کو تالا لگاتا ہو۔ چوری ہونا ایک طرف وہاں کسی چیز کا گم ہو کر گم رہنا محال ہے۔ مثالیں اس کی ہم پہلے دے چکے ہیں۔

چین میں مال کی فراوانی ہے اور قیمتیں یکساں ہیں۔ آپ کی چیز کو پیکنگ سے خریدیے یا شنگھائی میں لیجئے، ہوائی اڈہ ہو یا بازار کا اسٹور، کہیں قیمت میں کوئی فرق نہیں ملے گا۔ دکانیں ہر قسم کے مال سے منھامنہ بھری ہوئی ہیں اور کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور میں جایئے تو بھیڑ میں رستہ پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارے وفد کے ارکان کو یہاں سے دس دس پندرہ پندرہ پونڈ زر مبادلہ ملا تھا جو سب کو تھوڑا محسوس ہوتا تھا لیکن ہمارے پیر صاحب، پیر حسّام الدّین راشدی نے فرمایا کہ میاں کیوں پریشان ہوتے ہو، میں تو اتنا بھی نہیں لے رہا۔ تم کو کمیونسٹ ملکوں کا حال معلوم نہیں۔ میں پچھلے سال روس ہو آیا ہوں۔ وہاں دکانوں میں اتنی چیزیں ہیں کہاں؟ معمولی معمولی چیزوں کے لیے بڑے بڑے کیو لگتے ہیں۔ آخر ہم نے کہا کہ آپ لے لیجیے بچ رہے گا تو واپس کر دیجیے گا۔ وہاں وہ چیزوں کی فراوانی کا عالم دیکھ کر حیران رہ گئے۔ نہ صرف اپنے بیس پونڈ صرف کئے بلکہ اس سے دُگنے وہاں دوستوں سے ادھار لیے۔ پھر بھی واپسی میں رستہ بھر افسوس کرتے آئے کہ ہائے فلاں چیز نہیں لی، فلاں چیز رہ گئی۔

خان صاحب کی بھوک کمزور ہو گئی تھی

جن بزرگ کا تذکرہ ہے وہ چین کا دورہ کرنے والے ادیبوں کے وفد میں ہمارے ساتھی تھے۔ طبعی انکسار کے باعث اپنے نام کا اعلان شاید پسند نہ کریں، لہٰذا ہم ان کو صرف خان صاحب کے نام سے یاد کریں گے۔

خاں صاحب بزرگ آدمی ہیں، ساٹھ پینسٹھ سے اوپر عمر ہے لیکن بڑے کینڈے کے آدمی ہیں۔ (کاتب صاحب! کینڈے کے ک کو گ بنانے کی کوشش نہ کیجئے) پیکنگ میں پہلے ہی روز ہم جب ناشتے کی میز پر بیٹھے اور بیرے نے آرڈر لینا شروع کیا تو سب سے پہلے ہماری باری تھی۔ ہم نے کہا "ایک انڈا ہاف بوائلڈ۔" ہمارے دوسرے رفیق نے کہا "دو انڈے۔" خان صاحب کے آگے شمع پہنچی تو بولے "تین

انڈے۔"ہم نے پہلے یہ سمجھا کہ یہ ناشتے کی میز نہیں، نیلام گھر ہے اور بولی بڑھ رہی ہے۔ اب اس سے اگلا آدمی چار انڈے مانگے گا۔ پھر یہ خیال کیا کہ خان صاحب کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے لہٰذا عرض کیا کہ قبلہ صرف اپنے لیے آرڈر دیجئے، ساری میز کے لیے نہیں۔ اپنا آرڈر ہم دے چکے۔

خان صاحب نے کہا"جی میں اپنا ہی آرڈر دے رہا ہوں۔۔۔اور دیکھنا بیرا آٹھ توس، چند ٹکیاں مکھن کی، دلیہ، دہی اور کچھ بھنے ہوئے گُردے اور سبزی مچھلی وغیرہ بھی۔ لیکن جلدی۔۔۔ہاں کافی بھی۔"

"بہت بہتر جناب!"

"چاول ہیں؟"

"جی ہاں، ہیں۔"

"ایک پلیٹ ان کی بھی۔ شاباش میرے بھائی جھپاک سے۔"

بعض لوگ ناشتہ ڈٹ کر کر لیں تو پھر دن بھر کچھ نہیں کھاتے۔ ہم نے خان صاحب کو انھی میں سے شمار کیا۔ لیکن لنچ پر جب آدھے لوگوں نے چینی کھانے کا آرڈر دیا۔

اور آدھوں نے یورپین کھانے کا۔ تو بیرا فخر سے بولا کہ جناب پاکستانی کھانا چاہیئے تو اس کا بھی انتظام ہے۔ پراٹھے ہیں، دال ہے، سبزی ہے، بھنا گوشت ہے وغیرہ۔

خان صاحب نے کہا۔ "میاں ہمارے لیے تینوں لے آؤ۔ ولائتی کھانا تو خیر ہمیں مرغوب ہے لیکن اب چین میں ہیں تو تھوڑا چینی کھانا بھی چکھ کر دیکھیں اور پاکستانی کھانے بھی دیکھیں، تم کیا بناتے ہو۔ اس موقع پر انہوں نے حاضرین سے خطاب کر کے ماؤزے تنگ کا مشہور مقولہ بھی دہرایا کہ "رنگا رنگ پھولوں کو اپنی اپنی بہار دکھانے دو۔" اب چیئرمین ماؤ کا نام بیچ میں آئے اور کوئی دم مار سکے، ناممکن۔

قصّہ مختصر یہ کہ خان صاحب نے پہلے روز سے جس صلح کُل پالیسی کا آغاز کیا اسے آخر تک نبھایا۔ کسی پلیٹ سے اور کسی قسم کے کھانے سے کوئی تعصب نہ برتا اور کوئی پلیٹ دور رکھی جائے تو فوراً کسی رفیق سے فرماتے تھے وہ کیا چیز ہے اسے بھی تو ذرا دیکھیں، اب ہم جیسے نیاز مند بھی تعاون کرنے لگے۔ جہاں ان کی پلیٹ کو خالی ہوتے دیکھا ایک بڑے چمچے سے ایک نئی قسط ڈال دی۔ انصاف سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کا ہاتھ نہ روکا۔ کبھی کسی کی دل شکنی نہ کی۔ مچھلی ہو یا سبزی، بیف ہو یا دبنے کی چکی، خان صاحب نے سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھا۔ (دوسری وہ بند کر لیتے تھے)

چین کی چائے تو خیر خاص قسم کی ہوتی ہے۔ چند پتیاں اور پانی۔ نہ دودھ، نہ میٹھا۔ لیکن ہمارے لیے خاص طور پر اس جوشاندے کا انتظام کیا جاتا تھا جسے ہم اپنے ہاں چائے کہتے ہیں۔ وہاں اس کا نام خونچا ہے۔ خان صاحب بھی یہی پیتے تھے لیکن اس کا نسخہ بھی ان کا اپنا تھا۔ وہ اس میں ایک ٹکیا مکھن کی ضرور ڈالتے تھے اور اس کے بعد دودھ۔ لیکن ایک روز بیرے کو دودھ لانے میں کچھ دیر ہو گئی تو ہمارے مخدوم پیر حسام الدّین راشدی نے جو ان کا خاص خیال رکھتے تھے، فرمایا کہ حضرت دودھ نہیں تو نہ سہی ایک مکھن کی ٹکیا اس کے حصّے کی اور ڈال لیجئے۔ آخر اصل تو دونوں چیزوں کی ایک ہی ہے۔ خان صاحب کو یہ بات پسند آ گئی، تھوڑی دیر میں دودھ آ گیا تو ان دو ٹکیوں کے علاوہ انہوں نے کوئی آدھ پاؤ دودھ بھی ڈال دیا (یاد رہے کہ وہاں چائے اس کلاس میں دی جاتی ہے جس میں ہمارے ہاں موچی دروازے کے پہلوان لسّی پیتے ہیں) اس کے بعد دو ٹکیاں ان کا معمول ہوئیں۔ آپ نے کبھی آئس کریم کو دیکھا ہے جو رکھے رکھے پگھل گئی ہو۔ بس یہی رنگ ہوتا تھا خان صاحب کی چائے کا۔

چین میں ہماری قسمت میں حیرانی ہی حیرانی لکھی تھی۔ باہر جاتے تو چین والوں کے کارخانے، میوزیم، کمیون وغیرہ دیکھ کر حیران ہوتے تھے اور ہوٹل میں ہوتے تھے

تو خان صاحب کو دیکھ کر وجد کرتے تھے۔ ہم کبھی فیصلہ نہ کر پائے کہ ان دونوں میں زیادہ حیران کرنے والی کون سی بات ہے۔

ع ادھر جاتا ہے یا دیکھیں ادھر پروانہ آتا ہے۔

لیکن خان صاحب کی داستان ابھی ختم نہیں ہوئی۔ پیکنگ سے چل کر ہم وسط چین کے شہر ووہان پہنچے تو ایک شام خان صاحب کو قدرے پریشان پایا۔ ہم نے کہا ”خان صاحب! کیا بات ہے؟“

بولے۔ ”بات تو کچھ خاص نہیں لیکن یہاں کے بیرے میری زبان نہیں سمجھتے۔“

ہم نے کہا ”آخر ان کو اپنی زبان سمجھانے اور ان کی زبان سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ بہت سالا کر رکھ دیتے ہیں۔ ہم بہت سا کھا لیتے ہیں۔ اب رہی زبان دانی اس کا انتظام پیکنگ یونیورسٹی میں ہے جہاں ہماری زبان سکھائی جاتی ہے لیکن یہ خالص علمی مسئلہ ہے اس میں ہمیں آپ کو تردّد کی کیا ضرورت؟“

بولے ”آپ نہیں سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ پیکنگ میں بیروں کو معلوم تھا کہ صبح چار بجے اٹھ کر میں چائے کے ساتھ دو انڈے اور تین چار توس کھاتا ہوں وہ اس لیے کہ

پھر ناشتہ میں دیر سے یعنی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کرتا ہوں لیکن یہاں کے بیروں کو معمول کیسے سمجھاؤں۔ ترجمان بھی کوئی اس وقت موجود نہیں۔"

ہم نے کہا۔ "وہ جو آپ نے پون سیر دودھ کا گلاس اپنے کمرے میں بھجوایا ہے اور سیبوں کی قاب بھی میں دیکھ آیا ہوں، ان کا کیا ہو گا؟"

فرمایا۔ "وہ تو میرا سوتے وقت کا ناشتہ ہے۔ میں تو صبح کی بات کر رہا ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "یہ سحری آپ ہمیشہ سے کھاتے آئے ہیں۔"

بولے۔ "گھر میں تو نہیں لیکن پیکنگ میں اس کی پابندی کرتا رہا ہوں۔" خان صاحب سیب بہت رغبت سے کھاتے تھے اور انگریزی کے اس مقولے کا ورد کرتے جاتے تھے کہ روزانہ ایک سیب کھاؤ، ڈاکٹر کو بھگاؤ۔ ہم نے کہا "خان صاحب چین میں تو خیر بہت ڈاکٹر ہیں اور یوں بھی یہاں ہماری نوبت چند روزہ ہے لیکن اپنے ملک میں آپ نے اس ترکیب سے ڈاکٹروں کو دفع دفان کرنا شروع کیا تو مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔"

ہمارے خان صاحب کے اتنا کھانے کا اثر یہ تھا کہ وہ ہفتے میں بمشکل دو روز صاحبِ

فراش ہوتے تھے۔ ہمارے میزبان ہم پر ایسے مہربان تھے کہ ڈاکٹر کا بندوبست فوراً کرتے تھے۔ ایک روز جب ڈاکٹر ان کا احوال پوچھ رہا تھا تو ہم بھی قریب ہی تھے بس اتنی بھنک کان میں پڑی۔۔

"اور بھوک۔۔۔"

"بس بھوک ہی تو کمزور ہو گئی ہے۔" خان صاحب نے کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

ہمارا صحیح مقام شنگھائی والوں نے پہچانا

شنگھائی میں ہمارا جو عدیم المثال استقبال ہوا اگر وہ واقعی ہمارا تھا تو ہمیں چاہیے کہ ہر ماہ بس ایک بار شنگھائی ہو آیا کریں۔ وٹامن بی کمپلیکس اور ماء اللحم وغیرہ کے استعمال کی ضرورت نہیں، خون سیروں کے حساب سے خود بخود بڑھتا رہے گا۔ وہاں ہم ریل سے پہنچے تھے۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ دیکھا کہ ریلوے اسٹیشن کے صدر دروازے کے باہر قطار در قطار ہزاروں آدمی ہاتھوں میں ہار گلدستے اور غبارے لیے کھڑے ہیں۔ ہماری صورت دیکھتے ہی سب نے نعرۂ حیدری بلند کیا۔ پہلے تو خلقت کے اس اژدہام کو دیکھ کر ہم حیران و پریشان ہوئے۔ پھر ہمّت کر کے خود بھی نی ہاؤ نی ہاؤ۔۔یعنی بخیر بخیر کا آوازہ لگایا۔ ہم لوگ کاروں میں بیٹھے تو یہ ہجوم

اور بے قابو ہو گیا۔ ہر شخص ہماری دست بوسی پر مصر تھا۔ ہمارے ساتھیوں نے اپنے کالے کالے پنجے باہر نکال دیے کہ لو ان کو چوم لو، آنکھوں سے لگالو۔ پھر جانے ہماراچین آنا ہو کہ نہ ہو۔ نتیجہ اس والہانہ خیر سگالی کا یہ ہو کہ ٹریفک رکنے لگا۔ ہم سمجھے کہ ہنگامہ اسٹیشن کی حدود تک ہے، اس کے بعد میدان صاف ملے گا۔ لیکن اسٹیشن سے ہوٹل تک کئی میل تک یہی منظر تھا۔ لوگ یونہی صف آرا تھے اور دل و جگر ہماری راہ میں نچھاور کرنے کو بے تاب تھے۔ ہمارا اندازہ عموماً غلط ہوتا ہے تاہم قیاس ہے کہ کوئی دو تین لاکھ آدمی ہوں گے، اتنے نہیں تو پینتیس ہزار سے کم تو کسی صورت نہ تھے۔ زیادہ تر بچّے اور نوجوان لڑکے لڑکیاں، پولیس کے سنتری ان کو روکنے کی برابر کوشش کر رہے تھے کہ ہماری کاروں کے لیے رستہ رہے لیکن بے کار۔ آخر ہم نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ بھائیو! بہت ہو چکا۔ اب اپنے ہاتھ اندر کر لو اور بس دور سے سلام کرو، ورنہ کوئی حادثہ ہو جائے گا۔ دو تین بار کسی زہرہ جبیں کو کہ چین میں بھی ہوتی ہیں مصافحہ کی سعادت بخشنے کے لیے ہم نے ہاتھ نکالا تو وہ کسی اور بھلے مانس نے اُچک لیا۔

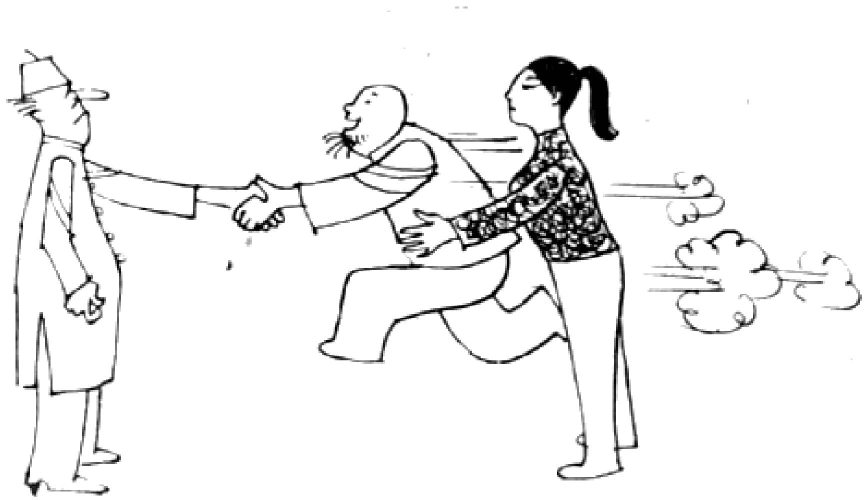
اب سنئے! ہمارے سبھی دوستوں کی باچھیں تو اس طرح کھلی ہوئی تھیں کہ وہ کوشش بھی کرتے تو سمیٹ نہ سکتے۔ لیکن ہمارے دل کو دگدا تھی کہ یہ سب کسی غلط فہمی کا

شاخسانہ ہے۔ خیر مقدم ہمارا سبھی شہروں میں ہوا تھا اور اچھا ہی ہوا تھا۔ صدر جانسن کا سا نہیں کہ جہاں جاتے ہیں لوگ انہیں کالی جھنڈیاں دکھاتے ہیں۔ لیکن ایسا جلوس کہیں نہ نکلا تھا۔ ہم نے اپنے دوستوں سے کہا کہ رفیقو، خدا جانے یہ حضرات کیا سمجھ کر آپ کو یہ عزّت بخش رہے ہیں۔ ہم نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آج شام البانیہ کا ایک وزیر شنگھائی پہنچنے والا ہے۔ ہو نہ ہو یہ اہتمام اسی کے لیے ہے۔ جب حقیقت کھلے گی تو یہ لوگ بھی شرمسار ہوں گے اور ہمیں بھی شرمسار کریں گے۔ ہماری بات ایک اور ساتھی کے توجی کو لگی باقی نے اسے ہمارے احساسِ کمتری پر محمول کیا اور کہا تم اس بات سے اندازہ مت کرو کہ اندرونِ ملک ہماری یوں آؤ بھگت نہیں ہوتی، وہاں تو لوگ ہم سے جلتے ہیں۔ ہمارا صحیح مقام وہی ہے جو چینیوں نے پہچانا ہے چونکہ چینی لوگ نہ اردو جانتے ہیں نہ بنگلہ۔ لہٰذا ہمارے دوستوں کی اس توجیہ میں کچھ وزن ضرور تھا لیکن ہم سوچ رہے تھے کہ اب اصل مہمانِ عزیز نجانے کیا کیا توقعات لے کر جو شنگھائی کی سرزمین پر قدم رکھے گا تو کیا سوچے گا۔ اس کے حصّے کے ہار تو ہمارے گلے میں حمائل ہیں اور جو گلدستے اتنی محنت سے اس کے لیے بنائے گئے تھے، یہ رہے۔ اس دوران میں لوگ بھی اپنا فرض ادا کر کے گھروں کو جا چکے ہوں گے۔ ہم نے ازراہِ تحقیق ترجمانوں سے پوچھا کہ صاحبو تم بھی

بیچ اس مسئلے کے کچھ بولو۔ انہوں نے منڈیا ہلا کر کہا ”جناب یہ خیر مقدم چاروں خانے آپ کا ہے ع گر قبول افتد زہے عزو شرف۔“ خیر ہم بھی ان کی جگہ ہوتے تو اب جبکہ چڑیاں کھیت چگ ہی گئی تھیں یہی کہتے اور مفت کا کریڈٹ لیتے کیونکہ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ نوکری جائے گی تو اس کی جو اس استقبال کے ہنگامے کا انچارج تھا۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ جہاں سے ہمارا جلوس گزر لیتا ہے بھیڑ چھٹنی شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی لوگ اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہوٹل پہنچ کر ہم نے اس کھڑکی سے جھانکا جو بڑی سڑک پر کھلتی تھی تو دو تین کاریں بصورت جلوس ایک دوسرے کے پیچھے آتی نظر آئیں۔ ان میں سے کچھ لوگ شرمندہ اور پریشان، گردنیں نکال نکال کر سڑک کے دورویہ جانے کیا دیکھ رہے تھے، غالباً استقبال کرنے والوں کو تلاش کر رہے تھے۔ ہمارے خیال میں ہوا یوں کہ معزّز مہمان (اصلی) کی گاڑی ہمارے بعد آئی۔ تب تک مطلع صاف ہو گیا تھا۔ خیر مقدم کرنے والے اپنے فرض سے ادا ہوئے۔ الاعمال بالنیات۔

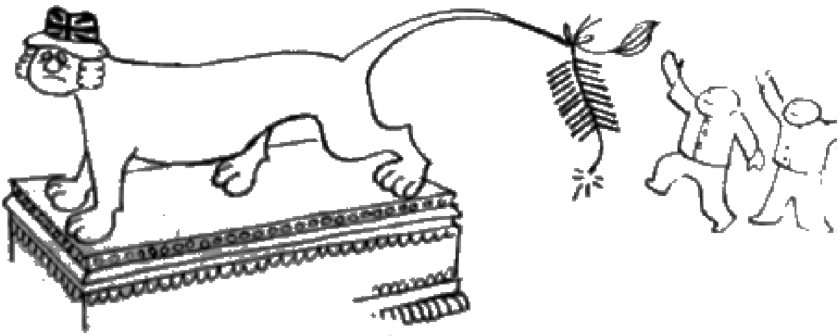
یہ تو خیر ہماری بے لاگ رائے ہے لیکن اگر ہمارے ساتھیوں کی رائے درست ہے اور وہ تحسینِ ناشناس واقعی ہمارے لیے تھی تو چینیوں کے حسنِ اخلاق معارف پروری اور کج مج نوازی کی داد دینی پڑے گی۔ ہم اب بھی اپنے کسی ساتھی سے اس

شبہے کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ سب غلط فہمی کا کارخانہ تھا تو وہ سمجھاتے ہیں کہ یہ بات نہیں۔ انسان کی قدر ہمیشہ وطن سے باہر جا کر ہوتی ہے جہاں اس کی اصلیت جاننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ سفر وسیلۂ ظفر کے مقولے کا یہی مطلب تو ہے۔



ہمارا ہوٹل۔ ہوٹل ساسون، عین رودبار کے سامنے اس بند گارڈن کے پہلو میں واقع تھا جس پر انگریزوں کے زمانے میں یہ تختی لگی رہتی تھی۔۔۔ کتّوں اور چینیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔۔۔ دریا کے رُخ جتنی بھی عالی شان عمارتیں تھیں انگریزوں اور دوسرے غیر ملکیوں کی تجارتی کوٹھیاں اور بینک وغیرہ تھے۔ بعضوں کے سامنے پیتل کے بڑے بڑے شیر۔۔۔ مرحوم شیر برطانیہ کی نشانی، اب تک ایستادہ تھے

(اب سُنا ہے سُرخ محافظوں نے ان کی دُم میں بھی نمدہ باندھ دیا ہے۔



شیر برطانیہ کی دُم میں نمدہ

یعنی ان کی زیارت کرنے والے ہم آخری لوگ تھے) ہوٹل ساسُون، ایک یہودی ساسون نامی نے اس صدی کے اوائل میں بنایا تھا۔ اور شنگھائی کا چوٹی کا ہوٹل تھا۔ اس کی طویل و عریض خواب گاہوں میں اب تک انگریزوں کی روحیں منڈلاتی ہوں گی۔ دروازوں، غسل خانے کے ساز و سامان، بھاری صوفوں، شاہانہ پلنگوں مُجلّا آئینوں اور منقّش میزوں پر لندن یا مانچسٹر کی کسی نہ کسی کمپنی کا نام پیتل کی پلیٹ پر نقش ہے۔ برناڈ شا جب ۱۹۳۴ء میں شنگھائی آیا تو اسی ہوٹل میں فروکش ہوا تھا۔ اور اسی کے عالی شان دروازے پر چین کے ادیبِ اعظم لوہسون کو اندر جانے سے روک دیا گیا تھا کیونکہ وہ چینی پاجامہ کرتا پہنے تھا، جیسے کراچی کے اونچے ہوٹلوں اور

کلبوں میں اب بھی بغیر ٹائی اور مغربی لباس کے جانے والوں کو روکتے ہیں۔ برناڈ شا کو اس سے ملنے کے لیے ہوٹل کے باہر آنا پڑا۔

اب ایک عجیب اور آسیبی اتفاق کی بات سنئے یا پھر یہ زمان و مکان کے اسرار ہیں کہ جب ہم نے ۱۹۴۹ء میں اپنی نظم شنگھائی لکھی تو اس کے دوسرے بند میں فرودگاہ کی منظر کشی یوں کی تھی۔

پائیں باغ کے گرجا کے گھڑیاں میں گیارہ بج بھی چکے ہیں

بازاروں کا شور و شعب بھی لمحہ بہ لمحہ تھمتا جائے

دریا کی پہنائی میں ایک اسٹیمر کی سیٹی گونجے

کس کو خبر ہے کس منزل کو جائے ہے اور کس کو بلائے

چاند نے بھی پورب کے جھروکے میں اپنا مکھ دکھلایا ہے

چاند سے باتیں کون کرے جب درد ہی دل میں امڈ آئے

اوپر ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے اور باتیں کرتے ہمیں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ نیچے

پانچویں منزل پر اُتر کر ہم نے اپنی خواب گاہ کے دریچے سے باہر جھانکا تو تمتماتا ہوا پورا چاند نیلے آسمان میں معلّق تھا۔ یکایک سامنے دریا سے ایک سٹیمر کی سیٹی گونجی اور پھر ہوٹل کے گھڑیال نے ٹن ٹن وقت کے گزرنے کی منادی دی۔ گنا تو پورے گیارہ بج رہے تھے۔



شنگھائی میں ایک مظاہرہ
ساسون ہوٹل کا کلاک ٹاور پس منظر میں

شنگھائی میں دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ چند قدم پر دریا کا وہ پُل تھا جہاں شنگھائی کے لیے

چیانگ کائی شیک اور ماؤزے تنگ کے سپاہیوں میں خوفناک اور فیصلہ کُن جنگ لڑی گئی۔ سینکڑوں آدمی اس چھوٹے سے قطعہ زمین پر کھیت رہے اور دریا کا پانی خونا خون ہو گیا۔ کومن تانگ والوں نے اِرد گرد کی تمام عمارتوں میں، ہمارے ہوٹل کی کھڑکیوں میں بھی، مورچے بنا رکھے تھے یعنی خود وار کر سکتے تھے لیکن انقلابیوں کی زد سے محفوظ تھے۔ ادھر تاریخ کا فیصلہ سب پر روشن تھا۔ شنگھائی کو انقلابوں کی آغوش میں آنا ہی تھا۔ اس لیے ان کی کوشش تھی کہ کسی عمارت کو گزند نہ پہنچے۔ ہر چیز صحیح سالم رہے اور وہ یوں ہوا کہ بستی کے لوگوں نے جتھّے بنا کر چیانگ کائی شیک کے سپاہیوں کو ان کمین گاہوں سے کھدیڑ باہر کیا۔ ساسون ہوٹل کے بیروں، خانساموں نے بلّموں، بانسوں، چھریوں، کانٹوں، میزوں کرسیوں اور اسٹولوں کے اسلحہ استعمال کیے اور ساری بستی۔

”یہ فتح مبین، فتح مبین، فتح مبین ہے“ کے ترانوں سے گونج اٹھی۔



شنگھائی میں لوہسون کا مکان



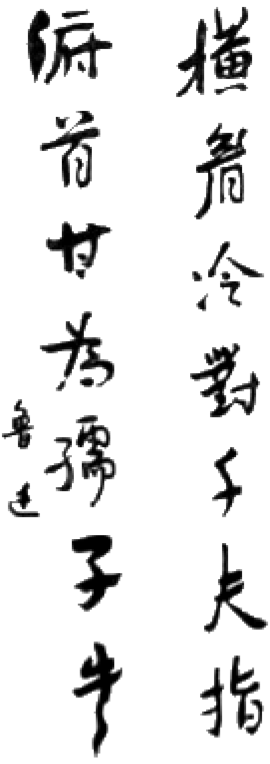
چین کا گورکی۔۔لوہسون

شنگھائی میں ہماری سیر کا آغاز بھاری اور ہلکی صنعتوں کی نمائش گاہ سے ہوا جو ہم نے صبح کو دیکھیں اور شام ہماری لوہسون کے میوزیم میں گزری۔ نمائش گاہ کے راستے میں ایک بہت بڑا چوک آتا ہے۔ جب چھ ستمبر کو بھارتی فوجیں لاہور پر یکایک حملہ آور ہوئیں تو اس چوک میں کوئی دس لاکھ آدمیوں کی ریلی ہوئی تھی جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ اس جارحیت کے خلاف ہم پاکستان کے دوش بدوش لڑنے کو تیار ہیں۔ ملکی اور تجارتی صنعتوں کی نمائش گاہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کے ہال کو جو شخص

ایک بار دیکھ لے وہ اس کی رفعت اور وسعت کو نہیں بھول سکتا۔ بڑے بڑے ستونوں کے بر آمدے سے گذر کر اندر جائیں تو سامنے ایک مہیب نیم قوس میں کہکشاں کی صورت ہال کا چہرہ جھمجماتا نظر آتا ہے۔ اس کے کئی خانے ہیں جن میں صنعتی مشینیں رکھی ہیں۔ افسوس کہ ہم میں انجنیئر کوئی نہ تھا۔ ہاں ایک خُردبین میں سب نے دلچسپی لی جو کسی چیز کو دولاکھ گنا بڑا کر کے دکھا سکتی ہے۔ جاننے والے کہتے ہیں کہ ایسا لنز تیار کرنا معمولی بات نہیں۔

لوہسون کہ چین کا گورکی کہلاتا ہے، پیدا تو غالباً ہانگچو میں ہوا تھا لیکن رہا زیادہ تر شنگھائی میں۔ یہیں اس کا مکان تھا۔ اوائل جوانی میں یہ بھاگ کہ جاپان چلا گیا تھا۔ واپس آکر صحافت اور درس و تدریس میں مشغول ہو گیا اور نوجوانوں کی ذہنی تربیت کی طرف توجہ کی۔ یہ آزادی اور آزادئ رائے کا متوالا تھا لہٰذا کومن تانگ کے جبر و تشدد کا شکار رہا۔ اس کی کہانیاں اردو میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں جن میں سب سے مشہور آہ کیو کی کہانی ہے۔ تمنائی نے زندہ چین کے نام سے نئے چین کی کہانیوں کا مجموعہ شائع کیا تھا اس میں تین کہانیاں لوہسون کی ہیں۔ اتفاق سے یہ مجموعہ ہمارے پاس تھا۔ جب ہم نے لوہسون کے میوزیم میں دیکھا کہ دنیا بھر کی زبانوں میں چھپے ہوئے لوہسون کے تراجم کے مجموعے وہاں رکھے ہیں تو اردو کی ماندگی کے لیے یہ بھی

اس میوزیم کو نذر کیا۔ لوہسون میوزیم کے مختلف شعبوں میں لوہسون کی زندگی کے مختلف ادوار دکھائے گئے ہیں۔ اس کی تحریریں بھی ہیں تصویریں بھی۔ اس کے جوتے، کپڑے، چھڑی، ٹوپی وغیرہ سبھی موجود ہیں۔ چیزوں سے زیادہ ان کے رکھنے کا سلیقہ دیکھنے کا تھا۔ ہم نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگر ہمارا اسی طرح کا میوزیم بنا دیا جائے تو ہم مرنے کو تیار ہیں۔ ایک دل جلے بولے تم نے کیا ہی کیا ہے؟ اور میوزیم بنانا ہے تو اقبال کا کیوں نہ بنایا جائے۔ تم بڑے ہو یا اقبال؟



ہماری ذاتی رائے اس باب میں کچھ بھی ہو، اس وقت ہم خوفِ فسادِ خلق سے خاموش ہی ہے۔

لوہسون کا ایک مشہور شعر بمعنی

’خاکساروں سے خاکساری ہے

سربلندوں سے انکساری نہیں‘

کرنا تجویز ٹوسٹ کا

اردو میں کہتے ہیں جامِ صحت نوش کرنا، انگریزی میں کہتے ہیں ٹوسٹ تجویز کرنا۔ جامِ صحت کی مثال ہم نے یہ دیکھی کہ ہمارے ایک دوست بہت دن اسپتال میں رہ کر آئے تو ہم ان سے ملنے گئے۔ دیکھا کہ ایک طرف سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی۔ ایک پیگ ہمارے سامنے خالی کیا، دوسرا بھرا۔ ہم نے کہا عزیزِ من یہ کیا حرکات ہیں۔ بولے ”بیماری سے اُٹھ کے آیا ہوں، جامِ صحت نوش کر رہا ہوں۔“ دوسرے روز معلوم ہوا کہ دوبارہ پابدست دگرے دست بدست دگرے اسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ ان کی بیماری کا باعث ہی جامِ صحت حد سے زیادہ نوش کرنا تھا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد ہیں۔(زندہ ہیں)

ٹوسٹ تجویز کرنا مغربی رسم ہے۔ جب پہلی بار ہمارے سامنے ایک دعوت میں کسی نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں ٹوسٹ تجویز کر رہا ہوں تو ہم نے میز پر نظر دوڑائی اور سب کچھ تھا ایک ٹوسٹ ہی نہیں تھے۔ ہم نے فوراً بیرے کو اشارہ کیا لیکن ایک تجربہ کار شخص نے ہمیں روک لیا کہ ہوش کی دوا کرو۔ خیر چین جانے تک تم خود تجربہ کار ہو چکے تھے۔ وہاں کی دعوتیں ایسی مکلّف ہوتی تھیں کہ کئی بار ہم نے اپنے چٹکی لی اور ساتھیوں سے پوچھا کہ ہم نواب واجد علی شاہ تو نہیں ہیں؟ قدحوں پر قدحے اور قابوں پر قابیں آ رہی ہیں۔ ہم نے اندازہ کیا کہ اگر کھانے والا تمام کھانوں کے ساتھ عدلِ جہانگیری برتے اور ذرا آہستہ کھائے تو لنچ کے ڈانڈے ڈنر سے اور ڈنر کے ناشتے سے بخوبی مل سکتے ہیں۔ ہم تو خیر پیٹ کے ہلکے ہیں۔ زیادہ کھانا تو کیا، بات تک ہضم نہیں کر سکتے، لیکن ہمارے ایک رفیق نے چینیوں کا چیلنج قبول کیا اور ان کو چاروں شانے چِت کیا۔ قابیں بھری آتی تھیں اور خالی چمکتی ہوئی اٹھتی تھیں۔ یہی صاحب تو تھے کہ دن میں پانچوں وقت کے کھانے کے علاوہ تہجّد کا ناشتہ بھی کیا کرتے تھے، یعنی آدھی رات کو اُٹھ کر چند انڈے ٹوسٹ پھل وغیرہ زہر مار کرتے تھے۔

ٹوسٹ میں یوں ہوتا ہے کہ ایک شخص گلاس اٹھا کر لمبی چوڑی تقریر کرتا ہے۔ اس

موقع پر ہمیں اقوامِ متحدہ کی ایک دعوت یاد آگئی جس میں امریکی مندوب نے روسی مندوبین کے سامنے ٹوسٹ تجویز کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ اور روس بھائی بھائی ہیں۔ ان کی دوستی مخلصانہ اور گہری ہے لیکن اگر روس کی طرف سے کوئی ایسی ویسی حرکت ہوئی تو ہم ہائیڈروجن بم کے استعمال میں تامّل نہیں کریں گے۔ روسی نمائندے نے اپنے جوابی ٹوسٹ میں اسی طرح کے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم بھی امریکہ کو اپنا ایک گہرا مخلص اور بے ریا دوست جانتے ہیں۔ لیکن اس کو اپنی طاقت کے بارے میں کسی دھوکے میں نہ رہنا چاہئے۔ اس نے ایٹم بم وغیرہ استعمال کرنے کی کوشش کی تو وہ میزائلوں سے اس کا بھرکس نکال دیں گے۔ خیر یہ مثال تو یونہی یاد آگئی۔ کہنا یہ تھا کہ ٹوسٹ میں باہمی خیر سگالی کے جذبات کے بعد لوگ اپنے جام ایک دوسرے کے ساتھ لگاتے ہیں اور پھر نوش کرتے ہیں۔ عام طور پر تو جرعہ جرعہ نوش کیا جاتا ہے لیکن چین میں جب میزبان یا ٹوسٹ تجویز کرنے والا انتہائے اخلاص میں 'کیمبے' کا نعرہ بلند کرتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ تمام تر حلق میں انڈیل جاؤ۔ جام ٹکرانے میں خاصی احتیاط درکار ہوتی ہے۔ ہم نے ایک بار میزبان کا جام زور کی ٹکر مار کر میز پر گرادیا تھا۔ اور ایک بار خود اپنا گلاس توڑ لیا تھا۔ لوگ تو چھوٹے چھوٹے جام استعمال کرتے تھے لیکن

ہمیں گلاس کے بغیر تسکین نہ ہوتی تھی جس کی وجہ بلا نوشی نہیں بے توفیقی تھی۔ ہم شراب کی بجائے سنگترے کا رس پیتے تھے اور چونکہ ہر کیمپے کے بعد گلاس خالی کرنا ہوتا تھا لہٰذا جتنا سنگترہ ہم نے چین میں نوشِ جان کیا ہے عمر بھر نہ کیا ہو گا۔ کراچی واپس آنے کے چند دن بعد ہمیں اپنا خون کا گروپ معلوم کرنے کے لیے بلڈ ٹیسٹ کرانا پڑا تو ہمارے دوست ڈاکٹر اکرم نے لیبارٹری سے واپس آکر کہا کہ فی الحال تو آپ کے سنگترے کے رس کا گروپ بتا سکتا ہوں۔ چند دن بعد جب آپ کی رگوں میں خون کی گنجائش پیدا ہوئی تو دوبارہ تشریف لائیے گا۔

ہمارے ایک دوست ہم سے کچھ پہلے اپنی بیگم کے ہمراہ چین تشریف لے گئے تھے۔ ان کی آؤ بھگت ہم سے کچھ زیادہ ہی ہوئی۔ لہٰذا ٹوسٹ تجویز کرتے کرتے ہلکان ہو گئے۔ رسم کے تقاضے سے کبھی ان کی بیگم کو بھی یہ فرض ادا کرنا ہوتا تھا۔ ان کی بیگم ان رسومات کو جانتی تو ہیں لیکن ان کی قائل نہیں۔ ان کے ساتھ ایک نستعلیق اردو مترجم بھی ہوتا تھا۔ لیکن جب کبھی وہ غیر حاضر ہوتا تب ان کے ٹوسٹ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہوتے تھے۔ میاں کہتے بی بی اب تم ٹوسٹ تجویز کرو۔ ہم انگریزی میں اس کا ترجمہ کیے جاتے ہیں۔ بی بی فرماتیں "اے نوج۔ یہ کیا کھڑاگ ہے۔ مجھ سے تقریریں نہیں ہوتیں۔" میاں اس کا ترجمہ کرتے کہ ہماری

بی بی فرماتی ہیں کہ چین کی ترقی نے ان کو بہت متاثر کیا ہے اور آخر میں فتح حق کی ہو گی۔ کبھی کبھی بی بی جھلا کر کہتیں۔ "میاں تمھی بولے جاؤ، مجھے تو پان کی طلب ہو رہی ہے۔ اے ہے کیسا ملک ہے جہاں پان بھی نہیں کھایا جاتا۔ انشاء اللہ ماشا اللہ کا قوام تک نہیں ملتا۔ ان کے میاں اس کا ترجمہ بھی فصیح انگریزی میں کرتے کہ یہاں کی عورتوں کے عزم و ہمّت نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے۔ اے ماؤں، بہنو، بیٹیو، دنیا کی عزّت تم سے ہے۔" بی بی انگریزی بھی جاتی ہیں۔ اگرچہ بولتی نہیں۔ فرماتیں۔ "اے میاں یہ تم کیا کا کیا کہے جا رہے ہو!" اس پر وہ کہتے بی بی چپ رہو میں تمہارے دلی جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ تمہاری ظاہری گفتگو سے مجھے مطلب نہیں۔

شنگھائی کے ہوٹل میں ایک روز ہمارے دوست ڈاکٹر وحید قریشی پر ایک حادثہ گزر گیا۔ بیرے نے مینو پیش کیا تو ڈاکٹر صاحب نے مچھلی کھانے کے موڈ میں تھے۔ جیلی فش پسند کی۔ یہ ایک لجلجا سا سمندری جانور ہوتا ہے لہٰذا جیلی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک دو لقمے کھائے تھے کہ ہمارے مخدوم پیر حسام الدّین راشدی نے ذکر چھیڑ دیا کہ ہمارے ہاں خوامخواہ سانپ کے خلاف تعصّب پایا جاتا ہے حالانکہ اس کے کھانے والوں کو جوڑوں کا درد کبھی نہیں ہوتا اور موٹاپا کم کرنے کے لیے بھی مفید ہے۔ ہاں ذائقے کا معلوم نہیں کیا ہوتا ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب سے مخاطب

ہو کر کہا، ”کیوں ڈاکٹر صاحب آپ تو کھا رہے ہیں۔ کیسا ذائقہ ہے اس کا؟“ ڈاکٹر صاحب یک لخت رُک گئے اور کہا۔ ”یہ سانپ ہے کیا؟ جی نہیں یہ تو مچھلی ہے۔“ ہم سے گواہی لی گئی تو ہم نے وضاحت کی کہ ہر چند یہ مچھلی نہیں، سمندری سانپ ہی ہے لیکن اس کے کھانے میں مضائقہ نہیں۔ چینی اسے بہت اشتیاق سے کھاتے ہیں اس لیے متعدد بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اب انہوں نے غور سے پلیٹ کو دیکھا تو کھانے کی شکل دیکھ کر خود ہی گھبرائے کہ یہ لجلجی سی چیز ہے مشتبہ۔ پیر صاحب نے کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ تو تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ کیوں ایسے وہموں میں پڑتے ہیں اور یوں بھی خدانخواستہ یہ ایسا جانور تو نہیں کہ ممنوع ہو یا مضر ہو۔ ہانگ کانگ میں تو چینی لوگ آپ کے سامنے زندہ سانپ کاٹ کر اس کے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دوسروں کی طرف دیکھا۔ بعضوں نے کہا یہ پیر صاحب آپ کو بنا رہے ہیں۔ مچھلی ہی ہے۔ اندیشہ نہ کیجیے، کھایئے۔ ہم نے بھی یہ دیکھ کر ان کی طبیعت نے مالش کرنا شروع کر دیا ہے ان کی غلط فہمی دور کرنے کو کہا کہ یہ نِرا مذاق ہے۔ مچھلی ہے شوق سے کھایئے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی طبیعت ان کے قابو سے گزر چکی تھی۔ سیدھے باتھ روم گئے اور اپنے سینے کا بار ہلکا کیا۔ اس کے بعد دو روز تک وہ صاحبِ فراش رہے اور کچھ نہ کھا سکے۔



چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

شنگھائی کے پاس جو کمیون ہم نے دیکھا وہ کینٹن اور ہانگچو کے کمیونوں سے زیادہ ترقّی یافتہ تھا۔ اس میں پانچ ہزار خاندان ہیں۔ ۲۷ ہزار آبادی، گیارہ ہزار ان میں سے زراعت کا کام کرتے ہیں۔ کمیون کے حلقے میں پندرہ پرائمری سکول ہیں جن میں پانچ ہزار لڑکے پڑھتے ہیں۔ ایک مڈل سکول ہے گیارہ سو لڑکوں کا۔ ۱۲۲ طلباء اس آبادی میں سے یونیورسٹی پڑھنے جاتے ہیں۔ زرعی رقبہ گیارہ سو ایکڑ ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ۱۹۵۰ء میں فی ایکڑ پیداوار ساڑھے بائیس ٹن تھی۔ ۱۹۵۷ء میں اکاون ٹن ہو

گئی اور ۱۹۶۵ء میں ۱۰۳ ٹن فی ایکڑ کو پہنچ گئی۔ ایک سو نوّے قسم کی سبزیاں یہاں پیدا ہوتی ہیں جو شنگھائی شہر کو مہیّا کی جاتی ہیں اور اس کے لیے کمیون کی ملکیت میں ایک ٹرک ہے۔ ۳۰سائیکل رکشہ اور ۵ سو ریڑھیاں۔ یہ کمیون ۱۹۵۸ء میں قائم ہوا۔ آمدنی فی کس ۱۹۵۷ء میں ۲۴۰ یوان سالانہ تھی۔ (ایک یوان یعنی دو روپے) ۱۹۶۵ء میں ۳۸۲یوان فی کس۔ یاد رہے کہ یہ فی کس آمدنی ہے فی خاندان نہیں۔ اشیائے ضرورت جیسی سستی چین میں ہیں اور کہیں نہیں۔ اس کمیون میں ایک کارخانہ چارہ کترنے کی مشینوں کا ہے اور ایک کھاد بنانے کا۔ یہ مصنوعات دوسرے کمیونوں کو بھی سپلائی ہوتی ہیں اور کمیون کی مشترکہ خوشحالی کی ضامن ہیں۔ حکومت کا اس کام میں کیا حصّہ ہے؟ پانچ فی صد ٹیکس اور بس۔

یہاں ہم کمیون کے گھروں میں گئے۔ چار چار گھر کا ایک دو منزلہ بلاک ہے اور اس کے ساتھ باغیچہ، پلنگ چھپر کھٹ۔ میزیں کرسیاں سب اچھی قسم کی۔ ہم نے پوچھا چھوٹے بچّے کہاں ہیں۔ معلوم ہوا نرسری میں۔ ہم نے کہا کہ نرسری دیکھیں گے۔ نرسری پہنچے تو ننھے ننھے بچے بے تابی سے ہماری طرف لپکے۔ ترانہ گایا اور سب سے ہاتھ ملائے۔ دو تین استانیاں ان کی خبر گیری کے لیے تھیں اور چھوٹی چھوٹی کرسیاں بنچیں جن پر تین سال، چار سال، پانچ سال کا بچہ بیٹھ سکے۔ یہاں ان کو ان کی

استعداد کے مطابق کچھ حروف اور ہندسے بھی سکھائے جاتے ہیں لیکن اصل تربیت عادات کی ہوتی ہے۔ صحت و صفائی کی خُو ڈالی جاتی ہے۔ یہاں نہ ڈنڈا ہے نہ چھڑی جو استاد کی ضرورت ہی نہیں۔ بچے دن بھر کھیلتے ہیں، خوش رہتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، گاتے ناچتے ہیں اور سہ پہر کو والدین کے کام سے آنے سے پہلے گھروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ بہت سے گھروں میں بیبیوں کو ہم نے گھر پر ہی دیکھا۔ غالباً ہر روز ان کا کام پر جانا ضروری نہیں۔ معاوضہ کام کے یونٹوں کے حساب سے ملتا ہے۔



نرسری میں ہم لوگوں کو بھی انہی بچوں کے برابر انہی ننھی منی کرسیوں پر جگہ ملی۔ کوی جسیم الدّین نے ایک بنگلہ گیت ان کو سنایا۔ کچھ گیت بچوں نے گائے اور اس کے بعد ناچ ہوا۔ اور تو سبھی لوگ ثقہ تھے، ہاں ہم اور اعجاز بٹالوی اس ناچ میں بچوں کے ساتھ شریک ہوئے۔

چین جانے والے پہلے مسلمان ہم نہیں تھے

پچھلے سال کا ذکر ہے ہمارے ایک عزیز دوست ہمارے پاس تشریف لائے۔ مزاج پرسی کے بعد کہنے لگے کہ مجھے وضو کرنا سکھا دو اور نماز کی سورتیں آتی ہوں تو وہ بھی یاد کرا دو۔ وضو کرنا تو ایک کتاب میں دیکھ کر ہم نے انہیں سکھا دیا لیکن سورتوں کے متعلق معذرت کر دی کہ ہمیں بس چار سورتیں نماز کی یاد ہیں۔ وہ آپ کو سکھا دیں تو ہمارے پاس کیا رہے گا لیکن یہ آخری وقت میں مسلمان ہونے کا خیال کیوں آیا؟

فرمانے لگے۔ میں چین جا رہا ہوں۔ یہاں تو اگر نماز نہ پڑھوں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اسلامی ملک ہے لیکن دوسرے دیس میں جا کر تو باقاعدہ نماز پڑھنی ہی چاہئے ورنہ وہ لوگ جانے کیا خیال کریں اور پھر وہ لوگ تو کمیونسٹ ہیں۔ بالکل ہی خدا کو

بھول گئے ہیں۔ مجھے تم اسلام سے ایسا بھی بیگانہ نہ سمجھو۔ ریس کورس بھی جاتا ہوں تو میرے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے اور کسی گھوڑے پر داؤ لگانے سے پہلے ایک بزرگ سے فال ضرور لیتا ہوں۔ پینا پلانا تو تم خود جانتے ہو ایک زمانے سے کم کر رکھا ہے۔ اب اس سے زیادہ اس عمر میں تو ہوتا نہیں۔



سنکیانگ کے کچھ علما

ہم نے دیکھا ہے کہ امریکی یا برطانیہ کو شاید لوگ دار الاسلام سمجھتے ہیں۔ وہاں جاتے ہوئے کوئی اس قسم کا تردّد نہیں کرتا لیکن چین یا روس جاتے وقت اپنے کپڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے اسلام کو بھی ڈرائی کلین کر کے لے جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ ایک آدھ نماز تو پیکنگ یا ماسکو کی جامع مسجد میں پڑھ کر اپنی تصویر کھنچوائے، پھر ان ملکوں میں کوئی مسلمان مل جائے تو پہلا خیال لوگ یہی کرتے ہیں کہ ضرور کوئی جعلیا ہے۔ ان کی حکومت نے ابھی اسے سکھا پڑھا کہ اور السلامُ علیکم کہنا سکھا کر ہمارے لیے تیار کیا ہے۔ ہم سے بھی کینٹن کی مسجد میں کہ وہاں کے مسلمانوں کے محلّے میں واقع ہے۔ دو صاحبوں سے ملوایا گیا تو ہم نے گمان کیا کہ مولوی صاحب کی داڑھی پر جو پانچ چھ بال ہیں محض ہمارے اعزاز میں اگائے گئے ہیں۔ نام ان دونوں صاحبوں نے ہمیں مسلمانوں کے سے بتائے۔ ایک ابراہیم صاحب تھے، اگرچہ اس کے ساتھ چوں چوں چن وغیرہ بھی لگتا تھا۔ دوسرے صاحب کا نام ہم بھول گئے۔ ہمارے ساتھیوں نے وہاں قرآن مجید کے نسخے ملاحظہ کرنے کے بعد شک کا فائدہ ملزموں کو دیا وہ بھی تب جب کہ ایک صاحب نے مولوی صاحب سے سورۃ فاتحہ سن لی۔ اس ایک سورت کو سن کر انہوں نے مولوی صاحب کو پاس ہونے کے نمبر اس لیے دے دیئے کہ خود ان کو صرف یہی سورت آتی تھی۔

اوروں کی بات تو جانے دیجئے، ہم تو سمجھ دار آدمی ہیں۔ ہم نے ان لوگوں کے آٹو گراف اپنی نوٹ بک میں لیے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ عربی رسم الخط سے واقف ہیں یا نہیں۔ بے چاؤں نے یہ سمجھ کر کہ ہم ان کی یادگار رکھنے کے لیے ایسا کر رہے ہیں، چپ چاپ دستخط کر دیے۔ ایک نے ان میں سے بتایا کہ وہ عربی بھی بول لیتے ہیں۔ یہ زبان چونکہ ہم میں سے کوئی نہ جانتا تھا اس لیے ان کی لیاقت کا تعین کرنے کی ہم نے ضرورت محسوس نہ کی بلکہ ان کے بیان کو کافی سمجھا۔ ہاں اس خیال سے کہ یہ لوگ ہمیں عربی سے بالکل نابلد ہی نہ سمجھ لیں، ہر فقرے کے ساتھ ساتھ (جو ہم انگریزی میں بولتے تھے) الحمد للہ، الحمد للہ کا التزام ہم ضرور رکھتے تھے۔ ایک آدھ بار ہم نے ماشاء اللہ اور جزاک اللہ کہہ کر بھی اپنے علم کی وسعت کا ثبوت دیا۔

تفنّن بر طرف، یہاں سے جانے والے بہت سے مسلمان چین جاتے ہوئے واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پہلے مسلمان ہیں جو چین کی دھرتی پر قدم رکھیں گے۔ وہاں جا کر انہیں تعجّب (اور شائد افسوس بھی) ہوتا ہے کہ ان سے کوئی ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ہی کچھ لوگ جا کر ان سے فضیلت کا یہ شرف چھین چکے ہیں۔ چین کے تانگ خاندان کی تاریخ قدیم میں مرقوم ہے کہ بادشاہ کاؤسنگ نے جس کا پایۂ تخت سیان تھا ۲۵ اگست ۶۵۱ء کو جو ۳۱ ہجری کے پہلے مہینے کا دوسرا روز تھا، خلیفۃ الاسلام کے

بھیجے ہوئے ایک وفد کو شرفِ باریابی بخشا۔ عرب ملّاح اپنے بیڑے لے کر جنوبی چین کی بندرگاہوں میں زمانہ قبل اسلام میں بھی آتے جاتے تھے لیکن وہ سلسلہ محض تجارتی تھا۔ تہذیبی تعلقات کی بنا ظہورِ اسلام کے بعد پڑی اور جیسا کہ بیان کیا گیا پہلی صدی ہجری کے اوائل ہی میں اموی اور عباسی خلفا کے عہد میں چین میں جو سفارتیں عرب سے آئیں ان کی تعداد بیسیوں تک پہنچتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں سیان میں جو کھدائی ہوئی تو وہاں سے اموی عہد کے سِکّے بھی برآمد ہوئے۔ بعد کی داستان طویل ہے، جن کو دلچسپی ہو وہ انجمن ترقّی اردو پاکستان کی شائع کردہ کتاب "چین و عرب کے تعلقات" میں دیکھ سکتے ہیں جو ایک چینی عالم مولوی بدر الدّین چینی نے لکھی تھی۔ یہ صاحب جامع ازہر کے فاضل بھی تھے اور جامعہ ملّیہ دہلی میں زیرِ تعلیم بھی رہے۔

چین میں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ عالم اسلام سے آنے والوں کا اثر صرف دین مبین کی تبلیغ تک محدود نہیں رہا بلکہ اسلامی دنیا سے وہ سائنس اور طب، ریاضیات اور ہئیت کے علوم کے تحفے بھی لائے۔ چینی کیلنڈر کی تدوین میں بھی ہجری تقویم سے مدد لی گئی۔

چینی سائنس دان جمال الدّین جو بارہویں صدی عیسوی میں گزرا ہے ایک بڑے

ہیئت دان تھا۔ چودھویں صدی میں ماشیخ اور دوسرے مترجموں نے عربی سے ترجمے کرکے چین کی سائنس کو ایسے ہی مالامال کیا جیسے عباسی عہد کے مترجموں نے اپنے ہاں کے علوم کی زمین کو آسمان کیا تھا۔ تیرہویں صدی کے سربرآوردہ چینی مترجموں میں بھی کاؤکے کنگ کے نام کے ایک مسلمان تھے اور اسی عہد کے ایک عالم شمس الدّین تو بہت مشہور ہیں جنہوں نے فلسفے، تاریخ، ادب، ریاضی، فلکیات، جغرافیے حتیٰ کہ انجنیئرنگ پر بیسیوں تصانیف چھوڑی ہیں۔ چین خاص کے مسلمان گورنروں اور جرنیلوں کے تذکرے کا یہاں موقع نہیں جنہوں نے ہر عہد میں بڑے معرکے مارے نہ دینی علوم کی درس گاہوں کا تفصیلی احوال ہم لکھ سکتے ہیں۔ چین کی ایک کتاب ''مسلمانانِ چین کی اصلیت'' میں جو سولہویں صدی کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ اسلام چین میں ۶۲۸ء میں پہنچا، وہ یوں کہ بادشاہ چیانگ کو آن نے خواب میں دیکھ کر ایک عجیب الشکل جانور اس پر حملہ کر رہا ہے اور ایک سفید عمامے والا شیخ آکر اسے بچاتا ہے۔ صبح کو بادشاہ نے وزیر سے اس کی تعبیر پوچھی تو ایک بڑے عالم نے بتایا کہ سفید عمامے والا شیخ وہ عرب قوم ہے جو غرب میں رہتی ہے۔ ان کی بڑی شوکت اور قوت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی مخالفت عنصر بغاوت کرنے والا ہے جس کا مقابلہ عرب کی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

یہ سن کر بادشاہ نے ایک سفیر بلادِ عرب بھیجا اور عرب فوج کی کمک مانگی۔ تین ہزار عرب سپاہی اس دعوت کے جواب میں آئے جو چینی مسلمانوں کے آبا و اجداد ہوئے۔ اس وفد کی قیادت تین معرکہ آرا کر رہے تھے۔ ایک کا نام قیس تھا۔ دوسرے کا اویس اور تیسرا وقاص۔ پہلے دو تو ہوا کی تاثیر سے راستے میں انتقال کر گئے۔ مگر وقاص کو اللہ تعالیٰ نے سلامت رکھا۔ وہ بادشاہ کے بڑے مکرم مہمان ہوئے۔

کچھ اور کتابوں میں بھی روایتیں آئی ہیں۔ کچھ قوی کچھ ضعیف۔ بہر حال کینٹن کے نواح میں جو مقبرہ حضرت ابی وقاص کا ہے اس کے متعلق بیان اور روایت یہی ہے کہ رسول اللہ کے صحابی تھے۔ جن کو اس میں شک ہے وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ وہ عالم عرب کی کوئی ممتاز شخصیت تھی جو پہلی صدی ہجری میں واردِ چین ہوئی۔

پیکنگ کی شاندار مساجد کا جلال و جمال دیکھنے والے کو مبہوت و متحیر کرتا ہے۔ ہانگ چو میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہے۔ یاد رہے اس وقت ہم خالص چینی الاصل علاقوں اور آبادیوں کی بات کر رہے ہیں ورنہ سنکیانگ کے ایغور، ترک اور تاجکستان اور قزاق تو ہیں ہی سلمان جو وسط ایشیا کا حصّہ ہیں اور قوقند و ختن سے ہم تہذیبی اور تاریخی طور پر آشنا ہیں۔



کینٹن کی جس مسجد میں ابراہیم صاحب اور دوسرے بزرگ ہمیں ملے، پرانے زمانے کی ہے اور اس کے احاطے میں ایک مینار ہے جسے ہم نے ماذنہ خیال کیا تھا لیکن معلوم ہوا کہ لائٹ ہاؤس کا کام دیتا رہا ہے۔ ہماری منزل حضرت ابی وقاص کا

روضہ تھی۔ یہ شہر سے چار پانچ میل باہر ہے۔ راستے میں مسلمانوں کا پرانا قبرستان آیا۔ بڑی ہری بھری جگہ ہے اور ان قبروں کے درمیان گزرتے ہوئے دل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ اس روضۂ مطہر کا اثر دل پر گہرا اور پائیدار ثابت ہوا۔ بزرگ دفن تو یہاں ہیں لیکن ان کے قدم ہانگ چو اور مشرقی چین کے دوسرے شہروں میں بھی پہنچے اور یوں کہنا چاہئے کہ اسلام کا پودا چین کی سرزمین میں انہی بزرگ نے کاشت کیا۔ روضے کے اندر بھی ایک مسجد ہے۔ ایک تنگ دروازے کے روضے کی گنبدی عمارت میں داخل ہو کر ہم سب نے فاتحہ پڑھی اور دل کو گداز گیا۔

سوچو میں کہ شنگھائی سے ڈیڑھ سو میل شمال میں ایک شہر باغات ہے اور پُر فضا ہونے میں ہمارے نزدیک ہانگ چو کی دلکشائی کو بھی مات کرتا ہے۔ ایک شام ہم یونہی بازار میں گھوم رہے تھے کہ ایک بڑا ہجوم ہمارے گرد جمع ہو گیا۔ کینٹن یا شنگھائی یا پیکنگ میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا لیکن سوچو چھوٹا قصبہ ہے اس لیے ان کا استعجاب قدرتی تھا۔ خیر سگالی کے سلاموں اور نعروں کے بعد ہم نے ان لوگوں کو رخصت کرنا چاہا لیکن Pied Piper کی کہانی کی طرح یہ ساری جمیعت ہمارے پیچھے ہو لی۔ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہم ایک احاطے میں داخل ہو گئے، جو لاوزے کا معبد تھا اور اس میں کوئی بیس گز اونچی مورتی اس کی رکھی تھی، وہاں سے

نکلے تو معلوم ہوا کہ ہجوم چھٹا نہیں اور بڑھ گیا ہے۔ اب ہم نے ٹیڑھی ٹیڑھی گلیوں کی بھول بھلیوں میں جانے میں عافیت دیکھی۔ یہاں کچھ امان ملی۔ یکایک کسی صاحب نے اشارہ کیا ”اُدھر دیکھو۔“ ہم نے نظر دوڑائی تو بورڈ نظر آیا ”اسلامیہ ہوٹل۔“

اسلامیہ ہوٹل والوں نے ہماری تواضع کرنے کی بہت کوشش کی جب یہ معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی مسلمان ہیں یعنی کریلے اور نیم چڑھے۔ لیکن اس کا موقع نہ تھا اور پھر یہ ہوٹل بہت صاف بھی نہ تھا جیسا مسلمانوں کا ہونا چاہیے اور ہمارے ہاں ہوتا ہے، ویسا ہی تھا۔ ہماری براہِ راست گفتگو تو اسلام علیکم اور الحمد للہ تک محدود رہی لیکن ترجمان کے ذریعے معلوم ہوا کہ وہ ساری آبادی مسلمانوں کی ہے یعنی اس حصّہ شہر میں بارہ مسجدیں ہیں اور اٹھائیس سو گھر مسلمانوں کے ہیں۔ ہم پاکستانی حلال و حرام کا خاص خیال رکھتے ہیں حتیٰ کہ لندن میں بھی بڑے بڑے بورڈ لگے ہوتے ہیں ”یہاں حلال گوشت ملتا ہے۔“ دریافت کرنے پر معلوم ہوا اس ہوٹل میں بھی ذبیحہ ہوتا ہے۔ کتّے بلیوں کا گوشت جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چینی کھاتے ہیں (اس میں بھی بہت مبالغ ہے) اسلامی ہوٹلوں میں نہیں ہوتا۔ اس پر مشرق وسطیٰ کا ایک اسلامی ملک یاد آیا جس کے ایک سولہ آنے اسلامی ریستوران میں ہم جا کر بیٹھے تو

بیرے نے کہا "صاحب کیا کھائیے گا۔ بکرے کا گوشت بھی ہے۔ گائے کا بھی ہے اور سوٗر کا گوشت تو بہت ہی عمدہ ہے۔"



کینٹن کی انگتا مسجد، اندر سے

ہم بھی ایک دن کے لیے گوریلے بن گئے

چین کو ہم نے اور ہمارے رفیقوں نے ایسے دیکھا جیسے ایک کہانی میں سات اندھے ایک ہاتھی کو دیکھتے ہیں اور پھر اپنی اپنی ٹٹول کے مطابق اس پر حکم لگاتے ہیں۔ جس کے ہاتھ اس کے کانوں پر جا پڑے اس نے کہا ہاتھی پنکھے جیسا ہے۔ جس کے ہاتھ دم آئی اسے وہ رسّی کا سا معلوم ہوا۔ ہمارے ایک ساتھی جن کا یہاں یونیورسٹی میں تنخواہ کا چکر چل رہا ہے کسی کارخانے میں جاتے تو یہی پوچھتے کہ یہاں لوگوں کی تنخواہیں کیا ہیں اور ترقی کا چانس کیا ہے۔ ایک اور بزرگ یہاں ٹھیکے پر پُل، چاہ، مسجد و تالاب اور ایسے ہی دیگر فیض کے اسباب بناتے ہیں، وہ یہی دریافت کرتے کہ اس عمارت پر کیا خرچ آیا حتیٰ کہ دیوارِ چین کے بارے میں بھی انہوں نے یہی استفسار

کیا۔ ایک محقق تھے کہ جاتے ہی پوچھتے، یہاں قلمی کتابیں ہیں کیا؟ ایک ہمیشہ سبزیوں کے بھاؤ پوچھتے یا یہ کہ یہاں کی گائیں کتنا دودھ دیتی ہیں۔ لیکن ایک صاحب ایسے بھی تھے کہ کسی جگہ پر پہنچتے ہی پہلا سوال یہ دریافت کرتے یہاں کوئی ٹائلٹ ہے؟ بھائیو مجھے بیت الخلا کی راہ بتاؤ۔ ان سے ہم نے کئی بار عرض کیا کہ خوراک بے شک مفت ہے لیکن پیٹ تو آپ کا اپنا ہے لیکن وہ اس برہانِ قاطع سے ہمیں خاموش کر دیتے کہ چین کوئی ہر روز تھوڑی آتا ہے۔ کھانے میں تکلّف کیا تو یہ لوگ کیا کہیں گے؟



ایک شام ہم نے شنگھائی کے بچوں کے کلچرل پیلس میں گزاری۔ بچوں کے لیے کلچرل پیلس یا قصرِ ثقافت وہاں ہر شہر میں ہے اور بڑے شہروں میں تو کئی کئی ہیں۔ واپسی سے ایک روز پہلے شنگھائی میں یہ ہمارے پروگرام میں تھا۔ گھر کے بھاگ دروازے سے نظر آ گئے۔ ہمیں کانٹے دار تاروں میں سے بیچ بیچ کے گزرنا پڑا۔ آگے ایک تین انچ چوڑی دیوار پر چلنا پڑا۔ پل صراط کی چوڑائی غالباً اس سے کچھ ہی کم ہو گی۔ ہمارے معمّر ساتھی تو بڑی مشکل سے سنبھلے۔ ایک آدھ جگہ کود پھاند بھی کرنی پڑی۔ تب ہم اس قصر کے دروازے پر پہنچے۔ ہم نے ایک خندق بھی اس طرح پار کی کہ آر پار رسّا بندھا تھا۔ اسے ہاتھوں سے پکڑ کر چلے۔ ٹانگیں ہماری خلا میں معلّق تھیں اور نیچے خندق تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ سب مشقیں بچوں کو سکھائی جاتی ہیں کہ کل کلاں ملک پر کوئی آفت آن پڑے، لڑائی ہو تو یہ ساری گوریلا کاروائیاں کام آئیں۔۔۔۔ ہمارے ہاں ایسے ہرڈل یا رکاوٹیں فقط باقاعدہ فوج کو سکھائی جاتی ہیں، وہاں بچوں سے شروع کی جاتی ہیں۔

اب دروازے پر بچے بچیوں کا ہجوم ہماری پیشوائی کے لیے کھڑا تھا۔ سب نے نعرے لگائے اور ترانہ گایا۔ فوراً ہی لپک کر دو دو بچیاں اور بچے ہم سے آ چمٹے اور ہمیں انکل بنا لیا۔ اب ہماری رہنمائی انہی کو کرنی تھی۔ بڑے خوبصورت اور سمارٹ بچے تھے

اور ہمیں اپنے قصر کے ایک ایک شعبے میں لے گئے۔ ایک جگہ بچیاں تصویریں بنا رہی تھیں۔ ایک جگہ بچے نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے۔ نشانے پر ایک امریکی جہاز تھا اور اسی کی شِست لینی ہوتی تھی، ایک جگہ میوزک ہو رہا تھا۔ بس سات سات آٹھ آٹھ برس کے بچے ہوں گے۔ ایک جگہ مشینیں ریڈیو وغیرہ کا انجر پنجر کھلا تھا۔ بچے خود ہی ریڈیو توڑ جوڑ رہے تھے۔ ایک طرف بیسیوں بچے مطالعے میں مشغول تھے۔ اچھی خاصی لائبریری تھی۔ یہ عمارت سہ منزلہ تھی اور یہاں بچے گرد و نواح سے ہر شام آتے ہیں۔ کھیلتے ہیں اور کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔ کتابوں اور کھیلوں میوزک اور ڈرامے سب میں ہم نے دیکھا کہ قومی نصب العین کو کسی صورت اوجھل نہیں ہونے دیا گیا۔ یہیں ایک کمرے میں پتلیوں کا تماشا دکھایا گیا۔ ہم نے پتلیوں کے تماشے اور بھی دیکھے ہیں لیکن ایسا کم خرچ بالا نشیں نہیں۔ ایک مشاق استاد بچوں کو یہ سب کچھ دکھاتا ہے۔ باہر ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں اگن بوٹ ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔ یہ بھی جنگی سرگرمیوں کی ایک شکل تھی۔

ہمارے دوست احمد علی خاں ڈان والے ابھی حال میں چین سے واپس آئے ہیں۔ بچوں کے کلچرل پیلس میں وہ بھی گئے تھے۔ پوچھنے لگے تم سرنگ میں بھی گھسے؟ ہم نے کہا نہیں۔ بولے۔ ظالموں نے مجھے تو ایک لمبی سرنگ میں گھُسا دیا کہ دوسری

طرف نکلو۔ سوٹ کا ستیاناس ہو گیا اور گھٹنے چھل گئے۔۔۔ چونکہ وہ سرنگ بڑوں کے لیے نہیں بچوں کے لیے تھی اس لیے ایک جگہ تو میں ایسے پھنس گیا جیسے ڈاٹ لگ گیا ہو۔ عینک نیچے گر پڑی اور ہاتھ میرے آزاد نہ تھے کہ اُٹھا سکتا۔ آخر ایک بچی نے دوسری طرف سے جھانکا، خیریت دریافت کی۔ پہلے میری عینک نکالی پھر مجھے برآمد کیا گیا۔

اسی طرح مزدوروں کے لیے ثقافتی مرکز ہیں۔ مزدوروں کا ایک کلچرل پیلس ہم نے پیکنگ میں دیکھا تھا جو ایک پرانے شاہی محل کی عمارت ہے اور جس کے چوبی ستون خدا جانے کس درخت کے ہیں کہ چالیس فٹ، ساٹھ فٹ شاید اس سے بھی زیادہ سیدھے چلے گئے ہیں۔ ایک ہی تنے کا پورا ستون ہے اور بیسیوں ستون ہیں۔ نہ جانے کتنی دور سے کن جنگلوں سے لائے گئے ہوں گے۔ لیکن زیادہ تفصیل سے ہم نے شنگھائی اور کینٹن کے پیلس دیکھے۔ یہاں بھی لوگ آتے ہیں پڑھتے ہیں۔ ڈرامہ منڈلیاں ہیں جو ڈرامے کھیلتی ہیں۔ ایک طرف میوزک کی کلاس ہے۔ دوسری طرف لائبریری ہے۔ شنگھائی کے کلچرل پلیس میں سائیکلوں کے کرتب بھی ایسے ایسے دیکھے کہ پیشہ ور مداری ہار مان جائیں۔ ان میں جو شخص ہمیں سب سے مشّاق اور باکمال نظر آیا تعارف پر معلوم ہوا کہ ڈاک خانہ میں ملازم ہے۔ چٹھیاں بانٹتا

ہے۔



مزدوروں کا ایک ثقافتی محل

انہی کسرتوں اور مشقوں کا توطفیل ہے کہ وہاں نہ ٹیڈی ازم ہے نا اعصابی بیماریاں، نہ نفسیاتی عارضوں کے ڈاکٹر۔ غالباً ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ سارے چین میں ایک ہی آدمی ایسا نظر نہ آیا جس کا پیٹ ذرا بھی بڑھا ہوا ہو یا جس کے چہرے پر

زردی ہو۔ آخر کیوں ہو؟

چینی مغربی طریقۂ علاج اور مغربی طرز کی دوائیں بھی ہیں اور مشرقی یعنی چینی بھی۔ ہر شہر میں ہم نے مغرب اور دیسی دواؤں کے سٹور دیکھے۔ ان کا طریقۂ علاج بہت پرانا اور مؤثر ہے۔ ہمارے حکیم محمد سعید دہلوی صاحب نے تو اس پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھ دی ہے لیکن اس طب چین سے اس کا تعلق ہونا ضروری نہیں جس کے اشتہارات آپ اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ یہ صاحبان کب چین گئے۔۔۔؟ کیوں گئے؟ کسی سے طب سیکھی اور کہاں سے سند حاصل کی۔ یہ وہی جانیں یا ان کے مریض پوچھیں۔۔۔ جاپان میں ہم نے انگوٹھیوں اور چھلّوں کے متعلق بھی پوچھا تو معلوم ہوا عطائیوں کا کاروبار ہے۔ ایٹم و یٹم کی بابت محض افسانہ ہے۔ وہاں کے محکمۂ صحت یا میڈیکل پیشے والا کا استناد اسے حاصل نہیں۔ یورپ میں بھی یہ چھلّے اور انگوٹھیاں بہت چلے اور ان کے متعلّق بھی یہی دعوے تھے کہ ہر مرض کا علاج ہیں لیکن بعد میں پیسے کمانے کا کارخانہ ثابت ہوئے تو حکومت نے پابندی لگا دی۔ ہمارے ہاں دیکھئے چین اور جاپان کے نام پر یہ کارخانے کب تک چلتے ہیں۔

سوچو میں تین دن

مئی کی آٹھویں تاریخ تھی کہ ہم نے سامانِ سفر باندھا۔ پیکنگ دیکھ چکے تھے۔ کینٹن جا چکے تھے۔ ووہان میں تین راتیں گزاری تھیں اور ہانگ چو کی سیر سے بھی دل کو شاد کام کیا تھا۔ لیکن حبِّ وطن از ملکِ سلیمان خوشتر والی بات ٹھیک ہی ہے۔ چینیوں کی بے پناہ خاطر عاطر اور تنجن و بریانی کے باوجود ہمیں اب وطن کی دال اور وطن کا خشکہ بلا رہا تھا۔ تین ہفتے بہت نہیں ہوتے لیکن اب دل اُوب گیا تھا۔ شنگھائی میں قیام کو بھی اب قریب قریب ایک ہفتہ ہو رہا تھا۔ لہٰذا ہم نے جلدی جلدی اپنے باقی ماندہ پیسے خرچ کئے اور سرِ شام جیبیں جھاڑ کر بیٹھ گئے۔ کوئی اور ملک ہوتا تو اچھی خاصی رقم بیروں، خانساموں اور چوکیداروں کی بخشیش کے حساب میں پس

انداز کرنی پڑتی لیکن یہاں بخشیش کا بھی کوئی ٹنٹا نہ تھا۔ آخری بار ساسون ہوٹل کے کمرہ نمبر ۵۳۶ کے درودیوار پر حسرت کی نظر کی اور چائی چن، چائی چن (خدا حافظ، خدا حافظ) کرتے ہوئے نیچے اُترے۔ موسم کچھ ابر آلود سا تھا بلکہ پچھلی رات مینہ بھی برسا تھا اور دن میں بھی ترشح ہوتا رہا تھا لیکن اب کچھ تھم سا گیا تھا۔ شبِ گذشتہ مشہور افسانہ نگار پاچن کی معیت میں دیر تک پاکستان اور چین کے ادبی مسائل پر گفتگو رہی تھی۔ پاچن ہمارا ہوائی اڈے پر خیر مقدم کرنے کے لیے پہلے سے روانہ ہو گئے تھے۔ ہمارے دوست لیجاہ ہمارے ساتھ تھے۔ موٹر دریا کے گھاٹ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی جس کی ساحلی سیر گاہ انقلاب سے پہلے جسم فروشوں کا مرکز تھی۔ پھر وہ محلّے آئے کہ چین کا حصّہ ہوتے ہوئے بھی چین والوں کے نہ تھے اس حصّے کو فرانسیسی سیٹلمنٹ کہتے تھے۔ وہ حصّہ جرمنوں کے زیر نگیں تھا اور یہ ساری قلمرو انگریزوں کی تھی اور یہاں سے وہاں تک جاپانیوں کا راج تھا۔ یعنی یہاں پولیس بھی اور قانون بھی غیر ملکیوں کے تھے۔

لیجاہ کو کہ وہاں کا ایک نامی انقلابی اور ناول نویس تھا اور بے حد خوش باش اور خوش اطوار۔ ہم اپنے دورانِ قیام میں ہمیشہ عالیجاہ کہتے آئے تھے۔ اس نے معنی پوچھے تو ہم نے بتایا کہ اس کا مطلب ہے عالی شان، بلند مرتبہ وغیرہ۔ اس نے بطیب خاطر

اسے قبول کیا لیکن اب واپسی میں ہم نے اس سے کہا کہ میاں ہم تم کو یہ خطاب دیے جارہے ہیں اسے باقی رکھنا۔ بڑی عزّت کا خطاب ہے۔ ہمارے ہاں رؤسا اور والیانِ ریاست وغیرہ کو عالیجاہ کہہ کر خطاب کیا جاتا تھا۔ تو وہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ بولا کیا جاگیر داروں اور والیانِ ریاست کو عالیجاہ کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ ہم نے کہا بے شک، بولا پھر آپ اسے واپس لیجئے۔ میں لیجاہ ہی ٹھیک ہوں۔ مجھے لیجاہ ہی کہئے۔ عالیجاہ کہلانا مجھے منظور نہیں۔

اب یہ سارا چین کہ جس کی زندگی کی نہج بھی نئ ہے اور سوچنے کی روش بھی نئ پیچھے رہا جارہا تھا۔ کسی شاعر کا مصرع یاد آرہا تھا۔ وہ گلیاں یاد آئیں گی جوانی جن میں کھوئی تھی۔ ہانگچو کی جھیل جس کا طواف ہم نے عین چودھویں کی رات کو کیا تھا اور شب بھر کسی کا چرچا کرتے رہے تھے۔ کینٹن یاد آیا جہاں ہم ۴ مئی کے شہیدوں کی یادگار کے باغ میں رنگا رنگ لباس والے ہزاروں طالب علموں کے ساتھ مل کر ہمارے ساتھیوں نے ان کے انقلابی پرچم اُٹھائے تھے۔ پیکنگ کے قومیتوں کے محل میں تبّت کے ہال میں وہ پنجرہ یاد آیا جس میں انسان کے بس کھڑے ہونے کی جگہ تھی۔ وہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ پیٹھ بھی نہ ٹیک سکتا تھا کیونکہ اس کی چوبی سلاخوں پر خار دار تار چڑھے تھے۔ اب وہ لوگ کہ ان پنجروں کے اندر تھے۔ اقصائے چین کے حکمران

نظر آئے اور ان کو قفس بند کرنے والے لوگوں کو ہانگ کانگ اور تائپے میں، کالمپونگ اور دہلی میں غیروں کے آگے بے غیرتی کا کاسہ پھیلائے سرگرداں دیکھا۔ پیکنگ کا چن شن پارک بھی یاد آیا جو امپیریل پیلس کے سامنے اونچی پہاڑی پر واقع ہے اور جہاں پہلے فقط بادشاہ ہی قدم رکھ سکتے تھے۔ یہاں ہم نے دیہاتیوں اور کسانوں اور مزدوروں کو اس میں دندناتے دیکھا۔ خود امپیریل پیلس کا شہرِ ممنوع بھی یاد آیا جس میں دروازے ہی دروازے، غلام گردشیں ہی غلام گردشیں تھیں اور آنگن ہی آنگن تھے۔ اس کے دیوانِ خاص اور دیوانِ عام کی کرسیاں اونچی رکھی گئی تھی تاکہ کسی عامی کا مکان اتنا اونچا نہ ہو پائے۔ اور اب ان اونچے مکانوں کے مکینوں کی ہڈیوں کا بھی پتہ نہ تھا۔ ہاں وہ درخت اب بھی باقی تھا جس کی شاخوں سے لٹک کر ایک ممترو بادشاہ نے خودکُشی کی تھی۔ اب ان مرتفع میدانوں میں نیلی پتلون اور واسکٹوں والے مزدور جوتوں سمیت گھومتے نظر آئے۔ دیوارِ چین بھی یاد آئی کہ جس کی بنیادوں میں ہزاروں بے گاری مزدوروں کی ہڈّیاں فاسفورس بن چکی تھیں۔ اب بادشاہ تھے، نہ درباری، نہ کاہن، نہ امیر۔ کانوں میں جمبول جابر کا آوازہ گونج رہا تھا۔ ”اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رُخ کرنا۔“

نہ جانے کب شنگھائی کا ائیرپورٹ آ گیا۔ پاچن اور ان کے ساتھ صف بستہ کھڑے

تھے۔ ہم خوشی خوشی نیچے اُترے کہ ان کو خدا حافظ کہیں اور رخصت ہوں لیکن ان کے چہرے سنجیدہ اور متوحش تھے۔ معلوم ہوا کہ پی آئی اے کا جہاز کینٹن سے چل کر شنگھائی آیا ضرور، لیکن بادلوں کے گھٹاٹوپ اندھیرے کے باعث نیچے اُتر نہیں سکا اور سیدھا پاکستان چلا گیا ہے۔ اب تین روز بعد آئے گا۔ انتظار، صاحبانِ انتظار، صبر حضرات صبر۔ اب پھر اوس سی پڑ گئی۔ تھوڑی دیر بیٹھے جس جس سے ہو سکا اس نے ٹیلیکس پر کراچی پیغام بھجوا دیا۔ چائے پی اور پھر انہی موٹروں میں سوار یہ قافلہ ساسون ہوٹل کو رواں ہو گیا۔ جاتے وقت جو رقت آمیز اور پر خلوص کلمات میز بانوں اور مہمانوں نے ایک دوسرے پر صرف کئے تھے وہ ضائع گئے۔ خیر اب مزید تین روز تھے اور شنگھائی تھی۔ پھر دوستوں کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو! لیکن راستے میں یکایک مجھے خیال آیا کہ روانگی کے وقت پیر حسام الدّین راشدی صاحب کو بڑے راشدی صاحب یعنی پیر علی محمد راشدی مدّظلہّ چھوڑنے آئے تھے تو تاکید کی تھی کہ شنگھائی جاؤ اور موقع لگے تو سوچو ضرور جانا۔ اسی پُر فضا مقام اور کہیں نہ پاؤ گے۔ لہٰذا ہم نے اپنی ڈائری نکال کر اپنی یاد داشت کو تازہ کیا اور میز بانوں سے کہا کہ صاحبو شنگھائی تو ہو چکی مضائقہ نہ ہو تو یہ جبری رُخصت سہ روزہ سوچو میں صرف کی جائے۔ ان کے بھی جی کو یہ بات لگی۔ چنانچہ ہوٹل پہنچتے پہنچتے یہ فیصلہ ہو گیا کہ

رات شنگھائی میں گزاری جائے۔ اگلی صبح ریل سے سوچو چلیں گئے۔ دو گھنٹے کا راستہ ہے اور پھر روانگی کی دوپہر شنگھائی واپس۔ سبھی نے کہ شنگھائی کی اونچی عمارتوں سے اُکتا چکے تھے اس تجویز پر صاد کیا۔ ہم نے اپنے کمرے میں آکر ردّی کی ٹوکری سے اپنی ہیئر آئل کی شیشی اور چپل نکالی جن کی ہمارے خیال میں ہمیں ضرورت نہ رہی تھی اور جن بیروں کو چائی چن اور خدا حافظ کہہ کر گئے تھے انہی کو نی ہاؤ اور السلامُ علیکم کہہ کر پھر یاد کیا۔

سوچو کا سفر بہت خوشگوار رہا۔ دو گھنٹے کی تو بات تھی۔ چائے کے نام پر خوشبودار گرم پانی پیتے گئے اور گپ ہانکتے گئے۔ پانچ لاکھ کی آبادی کا یہ قدیم شہر جو اپنے باغوں اور سیر گاہوں کے لیے مشہور ہے دریائے یانگسی کے جنوب میں شنگھائی سے نانکنگ جانے والی ریل کی راہ پر واقع ہے۔ تاریخ اس کی ڈھائی ہزار سال پرانی ہے اس کے فلک بوس پہاڑوں اور میناروں نے خدا جانے زندگی کی کتنی گردشیں دیکھی ہوں گی۔ یہ باغیوں کا شہر ہے لیکن باغ سے مطلب اس شہر میں محض سبزہ باغ نہیں ہے کہ پتھروں اور چٹانوں کو تراش کر عجب عجب نقشے بنائے گئے ہیں۔ جھیلیں ہیں اور ان کے اوپر سے گزرتے پیچ دار پل ہیں۔ جھروکے ہیں جن سے رؤسائے وقت بارش کے گرنے کا منظر دیکھتے تھے اور لطف اٹھاتے تھے۔ ان پرانے باغوں کا

اسلوب عجیب ہے۔ جس طرح پنجاب کے دیہات کے گھروں میں آنگن گھر کے آگے ہوتے ہیں اور چار دیواری میں سامنے ایک دروازہ ہوتا ہے، ایسا ہی چین کے باغوں کا حال ہے۔ سڑک سے گزرتے ہوئے کبھی یہ قیاس نہیں ہو سکتا کہ اس عام قسم کے دروازہ کے پیچھے کی دنیائے رنگارنگ ہے۔

باغ ایک سے ایک اچھا ہے لیکن ہماری کوشش کے باوجود حافظے میں ان سب کے نام گھُل مل گئے ہیں۔ کسی کی جھیل یاد ہے کسی کا سبزہ۔ کسی کا سائبان کسی کی پہاڑی۔ ہاں جو یادگار تصویریں اس موقع پر کیمرے نے کھینچیں ان سے نقشہ کچھ نہ کچھ بنتا ہے۔ چینیوں کی ایک خاص خصوصیت کہ ان کے آرٹ کا کمال ہے۔ کوتاہ قد درخت ہیں۔ باکمال باغبان ان کی تراش خراش اس طور پر کرتے ہیں کہ پورا درخت مع اپنے ٹہنیوں کے ایک ڈیڑھ فٹ اونچا جا کر رُک جاتا ہے۔ ہم نے ایسے درخت دیکھے جن کی عمر ایک صدی سے بھی زیادہ تھی لیکن گملوں میں لگے تھے۔ درختوں کے یہ مخفّف، لوگ اپنے ڈرائنگ روم میں سجاتے ہیں۔

دن بھر سیر ہوئی۔ بعض پگوڈے بھی دیکھے کہ دیکھنے کے ہیں۔ ان پر ہم چڑھے بھی اور اترے بھی لیکن سیر شبانہ کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ اس میں سوائے اعجاز کے کوئی ہمارا ساتھ نہ دیتا تھا۔ پہلی شام کوچوں میں ہوتے ہوئے رات کے گیارہ بجے ہم ایک

آباد گلی میں پہنچے۔ سامنے دیکھا کہ ریلوے اسٹیشن کو جانے والی راہ پر ایک شخص بڑا سامٹکا لیے کوئی ہانک لگا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ چائے بیچ رہا ہے اور خونِ دل کی یہ کشید مفت لگا دی ہے۔ یعنی دو دو پیسے کی پیالی ہے۔ ساتھ ہی کچھ مُرمُرے بھی تھے۔ واپسی پر ایک دیوار پر کچھ لکھا دیکھ کر ہم رُک گئے۔ ایک اور شخص بھی ہمیں دیکھ کر رُک گیا اور ہمارے پوچھے بغیر ہی بتانے لگا کہ یہ کیا ہے۔ لکھا تھا "پنج سالہ پلان کو کامیاب بنائیے۔"

یہ شخص جس کے ہاتھ میں ایک ٹونٹی دار کیتلی تھی اور لباس سے کسی کارخانے کا مزدور لگتا تھا بڑا ہی غالی قسم کا انقلابی تھا۔ اس کا کوئی فقرہ ماؤزے تنگ کی ستائش سے خالی نہ تھا۔ افسوس اس کی پوری کہانی ہمیں یاد نہیں رہی لیکن اس کی اپنی زندگی محنت اور قربانی کی مثال تھی اور اس کا خلوص ہمیں متاثر کیے بغیر نہ رہا۔

اگلی شب پروگرام تو اور بھی تھے لیکن معلوم ہوا کہ فلاں تھیٹر میں داستان گوئی کی محفل ہے۔ ہم نے شنگھائی کے مزدوروں کے محل میں ۔۔۔ جو ان کا قصر ثقافت ہے، داستان گوئی دیکھی تھی کہ ایک شخص کھڑا کہانی کہہ رہا ہے اور لوگ ہمہ تن توجہ اسے سن رہے ہیں لیکن یہاں کا نقشہ دوسرا تھا۔ دیکھا کہ اسٹیج پر ایک میز پر تین فرد بیٹھے ہیں۔ ایک مرد کہ میز کے صدر میں ہے اور دو خواتین داہنے بائیں۔ تھوڑی

دیر میں کسی نے طنبورے پر تنا تن کی، جو منادی تھی اس بات کی کہ صاحبو اب توجّہ۔ اس کے بعد مرکز میں بیٹھے آدمی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ سادھارن سا آدمی تھا اور معمولی انداز میں بول رہا تھا لیکن پھر اس کا چہرہ جاگا۔ بھوئیں جاگیں۔ آنکھیں روشن ہوئیں اور ہر موئے بدن زبان بن گیا۔ چہرے کا ایسا اتار چڑھاؤ ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ یہ داستان بھی طوطے مینا یا حاتم طائی کی تھی نہ اس میں ہوشربائی کا کوئی عنصر تھا کہ جاپانی قبضے کے دنوں کا ایک قصّہ تھا۔ جب کہانی میں ایک ڈرامائی موڑ آیا تو اس مرکز والے شخص نے توقف کیا اور دوسری لڑکی نے مالک مکان کا روپ دھار کر پٹ پٹ بولنا شروع کر دیا۔ اس کہانی کے گوریلا سپاہی کی باری تھی۔ اس موقع پر سرشتہ تقریر دوسری صاحبہ نے سنبھالا اور پھر بیچ میں وہ مرکز والا آدمی شروع ہو گیا۔ کسی کا کوئی پارٹ مخصوص نہ تھا اس لحاظ سے یہ داستان گوئی ڈرامے سے الگ چیز رہی لیکن ہم نے ایسے باکمال ایکٹر نہ دیکھے تھے کہ فقط آواز اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے پورا نقشہ کھینچ دیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو چین کی مشہور منڈلی تھی۔ دیہاتی زبان میں بولتی تھی اور سارا سال یہاں وہاں دیہات اور قصبوں میں گردش کرتی رہتی تھی۔ سوچو شہر تھا اس لیے یہاں ٹکٹ بھی تھا لیکن ہاؤس فل تھا۔ ہمیں تو معزّز مہمان ہونے کی وجہ سے جگہ دی گئی تھی۔

اپنے مترجم سے ہم نے کہا عزیزِ من جو کچھ یہ شخص کہہ رہا ہے ذرا اس کا ترجمہ کرتے جاؤ۔ اس نے کہا۔ ترجمہ کیسے کریں۔ اس کی زبان سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ شنگھائی کے نواحات کی بولی ہے۔ میں پیکنگ کا رہنے والا ہوں۔ ہم نے کہا تم شنگھائی کا اخبار تو صبح خوب پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مکتوبی یعنی لکھنے کی صورت ہر جگہ ایک ہے۔ فقط اس کو پڑھنے اور بولنے میں اختلاف ہے۔ اصل میں چینی حروف تصویروں کا شارٹ ہینڈ روپ ہیں۔ سمجھنے والا ان کا مفہوم سمجھتا ہے۔ لہٰذا پیکنگ والے کی لکھی ہوئی کتاب کو کینٹن والا سمجھ لیتا ہے۔ لیکن اگر بولنے کا اتفاق ہو تو زبان یار من ترکی بن جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں لیجئے کہ ایک چینی حرف ہے #۔ اس کو میں کہوں کا "یہ گھوڑا ہے۔" آپ پڑھیں گے "ایں اسپ است" تیسرا آدمی اس کا تلفّظ یوں کرے گا(ترجمہ نہیں)This is a horse ۔ہندی اُردُو کا معاملہ بالکل اس کے بالعکس ہے کہ آپ بولتے تو ایک دوسرے کو سمجھنے میں دقّت نہیں۔ ہاں لکھا ہوا ہے تو اُردُو رسم الخط کو پانڈے جی نہ پڑھ سکیں گئے اور ہندی رسم الخط کا منہ حافظ صاحب دیکھتے رہ جائیں گے۔

سوچو کا سوزن کاری کا اسکول دیکھنے کی چیز ہے۔ یہاں باریک ریشمی دھاگے سے کڑھائی کی تربیت دی جاتی ہے۔ لیکن کڑھائی ایسی کہ برش سے بنی ہوئی تصویر

معلوم ہوا اور پھر دونوں طرف سیدھا الٹا کچھ نہیں اگر اِدھر سے مور ہے تو اُدھر سے بھی جیتا جاگتا مور ہے۔ بہت دیدہ ریزی کا کام ہے۔ اگر کپڑے پر بلّی بنانی ہے تو پہلے ریشمی دھاگے کی بارہ باریک تاریں بنائی جائیں گی۔ پھر ویسی ہی ریشمی تار کشی کی چوبیس تاروں سے بلّی کی آنکھ کی سفیدی اور پتلی وغیرہ بنائیں گے۔ سینکڑوں شیڈ ہیں۔ ایک دوسرے سے بہت معمولی سہی لیکن فرق ہے۔ یہاں ہم نے دھاگے سے بنی ہوئی بڑی بڑی تصویریں دیکھیں۔ بعض کے بنانے میں دو دو تین تین سال صرف ہوئے ٹانکوں کی نئ اقسام ایجاد ہوئیں ہیں۔ ایسی کہ ننگی آنکھوں سے کہیں جوڑ نظر نہ آئے۔



شنگھائی کے بچوں کے قصر میں پاکستانی ادیب

حال سرنگوں کی لڑائی کا

چینیوں کی خاص اختراعوں میں ایک چیز انڈر گراؤنڈ یا زیرِ زمین لڑائی ہے۔ وہی حربہ ہے جسے اب جنوبی ویتنام میں گوریلے استعمال کر رہے ہیں۔ شمالی ویتنام میں بھی کرتے ہوں گے یا کریں گے۔

انڈر گراؤنڈ کا لفظ اصطلاحاً کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے سب جانتے ہیں۔ جو لوگ کھلے عام کوئی سیاسی کام نہ کر سکیں وہ چوری چھپے کرتے ہیں۔ چوری چھپے کام خواہ وہ کسی مینار کی چوٹی پر ہی پڑھ کر کیوں نہ کریں انڈر گراؤنڈ ہی کہلائے گا۔ قیام پاکستان کے کوئی دو سال بعد کی بات ہے کہ روس سے ایک وفد لاہور آیا جس میں تاجکستانی ادیب ترسونؔ زادہ بھی تھے۔ ان دنوں سجاد ظہیر پاکستان میں ہوا کرتے

تھے لیکن کہیں چھپے ہوئے تھے۔ ترسون زادہ نے، جو ان کے نام سے واقف تھے، ایک محفل میں پوچھا کہ "سید سجاد ظہیر کجاست۔"

فارسی اور تاجکی اپنی اصل سے ایک ہی زبان ہیں لہٰذا ایک فارسی دان پاکستانی نے کہا "او زیرِ زمین است"۔ ترسوں زادہ اور ان کے ساتھیوں نے تھوتھا سامنہ بنالیا اور کہا "اچھا ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی، کیا بیماری ہوئی تھی انہیں؟" اب یہ پاکستانی صاحب گبھرائے کہ ترسون زادہ کو کیسے سمجھائیں کہ زیرِ زمین ہونے اور مدفون ہونے میں فرق ہے۔ یہ تو ابھی فارسی الفاظ ڈھونڈ ہی رہے تھے لیکن ترسین زادہ ان کے اضطراب سے بات کو پا گئے اور بولے۔

"فہیدم فہیدم۔ او روپوش است۔" یعنی میں سمجھ گیا۔ روپوش ہیں وہ۔

لیکن یہ لڑائی جس کا ذکر ہے واقعی زمین کے نیچے سے لڑی جاتی ہے۔ اسے سرنگوں کی لڑائی بھی کہتے ہیں۔ آغاز اس لڑائی کا جاپانیوں کے خلاف جنگ کے دنوں میں ہوا تھا۔ جاپانی کسی گاؤں میں آتے تو گھر والے نیچے تہہ خانے میں چلے جاتے۔ قریب قریب ہر گھر والے نے ایک زیرِ زمین سرنگ کھود رکھی تھی جس کا منہ ڈھانپ دیا جاتا اور ساری رسد لے کر افراد خاندان اس میں سمٹ بیٹھتے۔ جاپانیوں کو پتہ چلا تو وہ

آ کر ان کو کھدیڑ نکالتے۔ اس سے بچنے کے لیے ہر گھر کے تہہ خانے یا سرنگ کو پڑوس کی سرنگ سے ملا دیا گیا اور یوں سرنگوں ہی سرنگوں میں ایک گاؤں کے اس سرے سے دوسرے حصّے کو چلے جایئے۔ کچھ دن یہ ہوا لیکن اب جاپانی آ کر پورے گاؤں کا محاصرہ کر لیتے۔ اس کا علاج ان باہمّت لوگوں نے یہ نکالا کہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک سرنگ لے گئے اور یوں پورے علاقے یا ضلع میں سرنگوں کا جال پھیل گیا۔

جہاں میں اہلِ ایمان صورتِ خورشید جیتے ہیں

اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

لڑائی میں دونوں طرف سے یہی ہوتا ہے۔ یہ ڈال ڈال وہ پات پات۔ وہ ڈال ڈال یہ پات پات۔ اب جاپانی یہ کرنے لگے کہ دو گاؤں کے درمیان میں ایک آڑی سرنگ کھودتے جو چینیوں کی سرنگ کو کاٹ دیتی۔ پیکنگ اور ہانگو کے درمیان بتیان میں تو ایک بار جاپانیوں نے ایک سرنگ کو دو جگہ سے کاٹ دیا۔ دونوں جگہوں کے درمیان آدھ میل کا ٹکڑا بالکل محصور ہو گیا۔ اس میں انہوں نے زہریلی گیس چھوڑ دی اور آٹھ سو دیہاتی مارے گئے۔ اب گاؤں والوں نے مسکوٹ کی کہ اس کا کیا اُپائے کیا

جائے۔ پہلی بات تو یہ کہ سرنگیں سیدھی نکالنا چھوڑ دیں۔ ٹیڑھی میڑھی گھما پھرا کے لاتے تھے۔ پھر ایک سرنگ کے ساتھ ساتھ تھوڑے فاصلے پر دوسری سرنگ جاتی تھی۔ ایک میں گیس آئی یا کوئی اور خطرہ پیدا ہوا تو دوسری میں چلے گئے اور درمیانی راستہ بند کر دیا۔ ایک سرنگ زمین سے دس فٹ نیچے ہے تو دوسری بیس یا تیس فٹ نیچے بنالی۔ ہوتے ہوتے گیس کے دفعیے کے لیے دوسری تدبیریں بھی نکال لی گئیں۔ معلوم ہوا لہسن اور ٹھنڈے پانی کا محلول اس کے اثرات کو زائل کر دیتا ہے۔ زیادہ شدّت ہوتی تو زیرِ زمین ہسپتال بھی موجود تھے۔

جاپانی گاؤں میں جاتے تو آدم نہ آدم زاد۔ غلّہ نہ مویشی۔ ہاں پاؤں اِدھر سے اُدھر پڑ گیا یا کسی طاقچے میں ہاتھ ڈالا تو فوراً بم پھٹا اور پرخچے اڑ گئے۔ ان سرنگوں میں جابجا ایسے روشن دان اور سوراخ رہتے تھے جو باہر سے نظر نہ آتے تھے۔ ہاں اندر والے خالی آنکھ سے یا دوربین سے دُور دُور کی خبر رکھتے۔ باہر بارودی سرنگیں بچھی رہتی تھیں جو اندر سے ایک رسی کھینچنے سے پھٹ جاتیں۔ جونہی کوئی جاپانی دستہ ان سرنگوں کے پھندے میں آیا بس رسّی کو ایک جھٹکا دیا اور سب کا جھٹکا کر ڈالا۔ ان بارودی سرنگوں کا سنئے۔ یہ لوگ خس خانہ وبرفاب کہاں سے لاتے، بس دیسی ہوتی تھیں۔ کوئی کیتلی کوئی بدھنا۔ کوئی بوتل ہاتھ آگئی اس میں بارود اور کرچیاں بھریں

اور ٹھیک ہے۔



کوئی کنستر مل گیا تو واہ وا، بڑی سرنگ بن گئی۔ جہاں ان کی بھی قِلّت ہوئی وہاں پتھروں کو کھوکھلا کر کے بم بنالیا گیا۔ پتھر کو کھوکھلا کرنا آسان کام نہیں۔ کر کے تو دیکھئے لیکن بس یہ کرتے تھے اور منہ میں لکڑی کا ڈاٹ لگا سڑک کے کنارے ڈال

دیا۔ اب سڑک پر سینکڑوں پتھر پڑے ہیں۔ کسی کسی سے بچیں۔ جاپانی فوجی خربوزوں اور تربوزوں کے کھیتوں میں بھی بہت لوٹ مچایا کرتے تھے۔ اب اس سے بھی ہاتھ کھینچا کیونکہ ایک دو بار ایسا ہوا کہ کسی تربوز پر ہاتھ ڈالا اور اس کے اندر چھپی ہوئی سرنگ بھک سے پھٹی۔ اب وہ کھیتوں میں سے بھوکے گزر جاتے تھے۔ بھوک کا خیال کریں یا جان کا۔ طرح طرح کی سرنگیں تھیں اور قسما قسم کے بم، اور لطف یہ ہے کہ کسی کارخانے کے بنے ہوئے نہیں۔ دیہات میں پٹاخے بنانے والے آتشباز انہیں بناتے تھے بلکہ پھر تو سب بنانے لگے۔ پتھر کی سرنگوں میں ایک بڑا کمال تھا کہ جاپانیوں کے دریافت کرنے والے بہترین آلات بھی بیکار ہو جاتے تھے۔ جاپانی خود ان سرنگوں میں قدم دھرتے ڈرتے تھے۔ جا بجا بم چھپے ہوئے ہیں اور پھر جا بجا سرنگ کے فرش میں گڑھا کھود کر اسے گھاس پھوس سے پاٹ رکھا ہے۔ اندر بانس کی نوکیلی کھپچیاں گڑی ہیں جو گرا وہیں چھد کر رہ گیا۔ یا پھر کسی موڑ پر کوئی کوٹھری سی بنی ہے جو کسی طور نظر نہیں آتی۔ اس میں ایک دیہاتی گنڈاسا لیے کھڑا ہے۔ ایک وار کیا اور بھُٹا سا سر اُڑا دیا۔ سرنگوں کی بغل میں حجرے بھی بنے تھے۔ اگر کوئی جمعیت کسی حجرے میں چلی گئی تو یک لخت کھٹکا گرتا تھا اور سب اندر بند۔ اس حصار میں یا تو کسی نے باہر سے کوئی بم اچھال دیا یا کسی بارودی سرنگ کی رسّی کھینچ دی۔

القصّہ زندہ کوئی نہ نکلتا تھا۔

جاپانی بہت زچ ہو گئے تو یوں کرنے لگے کہ کسی چینی دیہاتی کو جو ان کی قید میں ہوتا آگے آگے رکھتے۔ لیکن رسی ہمیشہ ایسے موقع پر کھینچی جاتی جب وہ گذر چکتا۔ چھپے ہوئے لوگوں کو قدموں کی چاپ ہی سے اندازہ ہو جاتا کہ کون ہے۔ اگر ننگے پاؤں ہے یا بان کے سینڈل پہنے ہے تو کوئی چینی ہے۔ چمڑے کے بوٹ کی بھاری دھمک موت کا پروانہ تھی۔



ایک بار کی سنئے۔ جاپانی ایک گاؤں میں گئے۔ کھیت کھلیان سب چھان مارے، نہ کوئی آدمی، نہ کوئی دانہ اناج کا ہاتھ آیا۔ لیکن سرنگ کا راستہ دریافت ہو گیا۔ ایک سؤر شامت کا مارا مل گیا۔ اس کی دم سے انہوں نے زہریلی گیس کا کنستر باندھا اور پیٹھ پر مٹّی کا تیل ڈال آگ لگا دی۔ وہ چنگھاڑتا ہوا سرنگ میں گھس گیا۔ اب ترکیب نمبر ۱۱۴ استعمال کرنے کا وقت تھا۔ فرش میں ایک بڑا سا گڑھا پانی سے بھرا تھا، اس کا تختہ اٹھا دیا گیا، حضرت سؤر قعرِ فنا میں غرق ہوئے اور گیس بیکار ہو گئی۔ لیکن یہ ساری ترکیبیں تب ایجاد ہوئیں جب بے اماں دشمن کے ہاتھوں کتنی ہی جانوں کا نقصان ہو چکتا۔

جاپانی دیہاتیوں کو ہراساں کرنے کے لیے اور یہ جتانے کے لیے کہ ان کی بھاری قوّت موجود ہے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے جا بجا دمدمے بنا رکھے تھے۔ سپاہیوں سے (بظاہر) بھرا ہوا ٹرک آتا اور دمدمے میں خالی ہو کر چلا جاتا۔ اصل میں آدمی چار چھ ہی ہوتے تھے، باقی سب ربڑ کے ڈمی سپاہی ہوتے۔ دمدمے میں ان کی ہوا نکال لی جاتی اور وہ پچک جاتے۔ یہ بھید بھی جلد ہی کھل گیا۔ ایک گاؤں میں جب کہ سبھی لوگ زیرِ زمین جا چکے تھے، انہوں نے گراموفون پر ایک ریکارڈ لگا دیا جس میں ٹرکوں کی گھِرر گھِرر بند ہوتی تھی، یوں لگتا

تھا کہ دس ٹرک آ رہے ہیں، دس جا رہے ہیں۔ گاؤں والے دو دن تو دبکے بیٹھے رہے کہ باہر نکلنے میں جاں کا زیاں ہے۔ اس کے بعد کسی سیانے نے غور کیا اور کہا کہ آواز تو آتی ہے لیکن دھمک نہیں آتی۔ باہر نکل کے دیکھا کہ دو تین جاپانی ہیں یا گراموفون ہے۔ جاپانیوں کو تو انہوں نے قابو کیا اور گراموفون پر نور جہاں کے نغموں کے ریکارڈ لگا کر جشن منایا۔



چینیوں کے لڑنے کے طریقے اب تو ممکن ہے کسی کتاب میں ہوں لیکن بس دہقانوں کی ایجاد تھے۔ ہوتا یہ کہ کچھ چینیوں نے جاپانیوں کے کیمپ پر چھاپہ مارا اور

انہوں نے جھلّا کر ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ جہاں راستے میں کوئی بستی آتی دو چار سٹک کے رہ گئے۔ پانچ چھ نے اگلے گاؤں میں کنارہ کیا۔ دیہاتی برابر طرح دیے جاتے کہ اِدھر کو گئے ہیں۔ جانے نہ پائیں۔ تیسرے گاؤں کے باہر نکل کر جاپانی آنکھیں مل مل کے دیکھتے کہ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ الٹے پاؤں لوٹے تو مارنے کو چوکس، کوئی کسی درخت پر لٹکا ہے، کوئی چھت کی منڈیر سے نشانہ لیے ہے، بس کوئی قسمت والا ہی جان سلامت لے کر جاتا تھا۔

ہماری یہ بڑی خواہش تھی کہ سرنگوں کا یہ جال اپنی آنکھوں دیکھتے جائیں لیکن پیکنگ یا شنگھائی کے نواحات میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی اور پھر یہ جاپانیوں سے لڑائی کے زمانے کی بات ہے۔ بیس برس سے اوپر ہو گئے۔ سنا ہے شمالی چین کے صوبہ ہوپی میں جو اس قسم کی جنگ کا گڑھ تھا کچھ آثار اب بھی باقی ہیں۔ ایک فلم البتہ سرنگوں کی لڑائی کے متعلق ہم نے دیکھی اور واقعی دیکھنے کی چیز ہے۔ یا پھر چینی انقلاب کے میوزیم میں انہوں نے ماڈل بنا رکھے ہیں۔ یہیں وہ پتھروں کی سرنگیں نظر آئیں اور لکڑی کی توپیں بھی۔ اتنا اسلحہ یا اسلحہ کے لیے دھاتیں کہاں سے لاتے۔ چینی تو بس کسی مضبوط سی لکڑی کا لٹھّا لیتے اور اس میں آرپار سوراخ کر لیتے۔ یہ توپ کی نال بن گئی۔ زیادہ مضبوطی کے ہے کہ پھٹ نہ جائے اوپر سے لوہے یا تانبے کے تاروں سے

جکڑ دیا۔ بات یہ ہے کہ اصل چیز اسلحہ نہیں ہوتا۔ اسلحے کے پیچھے والا آدمی ہوتا ہے۔



لانگ مارچ کا آخری مرحلہ، دشت تو دشت تھے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

لانگ مارچ کی کہانی (۱)

جانے کے صدیاں پہلے ہنی بال بادشاہ نے ہاتھیوں کے ساتھ کوہ الپس عبور کیا تھا، وہ واقع دنیا کی تاریخ میں اب تک سنگِ میل گنا جاتا ہے۔ لیکن ۱۹۳۴-۳۵ء میں چینیوں کے لانگ مارچ کے سامنے وہ بچّوں کا کھیل تھا۔ دوسری ہجرتوں میں سے بھی تعداد اور فاصلے کے لحاظ سے کوئی اس کا لگّا نہ کھا سکے گی۔ ہاں منگولوں کے خروج کو آپ نظیر میں پیش کر سکتے ہیں لیکن وہ ایک فاتحانہ خروج تھا اور جہاں رکاوٹ دیکھتا تھا، یہ سیلاب اپنی مرضی سے اپنا رُخ بدل لیتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جو قافلے آگ اور خون کے دریا عبور کر کے سرزمینِ پاک کی امان میں آئے ان کو اس واقعے سے ایک گونہ نسبت دی جا سکتی ہے لیکن خیر آپ یہ داستان سن کر خود فیصلہ کیجئے گا۔

اس قافلے نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو دریائے یانگسی کے جنوب میں کیانگسی کے صوبے سے کوچ کیا اور ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو انتہائے شمال مغرب میں نیّان میں پہنچ کر دم لیا۔ کسی کے حصّے میں چھ ہزار میل کی مسافت پڑی۔ کسی کے حصّے میں آٹھ ہزار میل بھی آئے۔ چٹا گام سے پشاور تک کا فاصلہ اندازاً دو ہزار میل ہو گا۔ یہ مسافت اس سے تین چار گنا جانیے اور پھر تمام تر پیدل۔ جتنے لوگ کمر ہمّت باندھ کر نکلے تھے ان کا بس ایک حصّہ منزل تک پہنچا۔ باقی تاریک راہوں میں مارے گئے۔ چیانگ کائی شیک کی نانکنگ حکومت کی افواج قاہرہ کئی گنا جمعیت میں گھیرے ڈالی تھیں۔ راستے میں مورچے بنائے ہوئے تھیں۔ آبادیوں اور کھیتوں کو اُجاڑ رہی تھیں۔ دریاؤں کے ناکے روکے ہوئے تھیں اور دجل و تلبیس کے پھندے پھیلائے ہوئے تھیں۔ اس قافلے کو ۳۶۸ دن کے سفر میں دشمن سے روزانہ ایک جھڑپ کا اوسط پڑا۔

پورے پندرہ دن گھمسان کی خونریز لڑائی میں صرف ہوئے۔ ۲۳۵ دن چلنے چلنے مدام چلنے میں صرف ہوئے اور ۱۸ راتیں کوچ میں بسر ہوئیں۔ ۱۰۰ دن کے مجموعی پڑاؤ میں جس میں بے شمار جھڑپیں بھی ہوئیں۔ ۵۶ دن اکیلے شمالی زیچوان میں صرف ہوئے اور باقی پانچ ہزار میل کی مسافت ۴۴ دن میں طے کرنی پڑی گویا ۱۱۴ میل چلنے کے بعد ایک پڑاؤ کی اوسط رہی۔ روزانہ مسافت کا اوسط ۲۴ میل پڑا۔ اور

وہ ایسے ہیں کہ یہ سیدھا اور صاف اور میدانی راستہ نہ تھا۔ دشوار گزار پہاڑیاں تھیں۔ خطرناک گھاٹیاں تھیں۔ وحشی جنگل تھے اور غدّار دلدلیں تھیں اور دشمن کی بے محابا فوجیں تھیں۔ تمام جدید سامانِ حرب سے آراستہ۔

یہ قافلہ ۱۸ پہاڑی خطوں سے گزرا جن میں سے پانچ ایسے بھی تھے کہ بارہ مہینے برف میں ڈھکے رہتے تھے اور قافلے میں جنوبی چین کے لوگوں کی اکثریت تھی جو ہمیشہ گرم آب و ہوا کے عادی رہے ہیں۔

اس قافلے نے چوبیس دریا پار کئے ۱۲ صوبے اس کے راستے میں آئے اور دس جنگجو سرداروں کی فوجوں کا گھیرا اس نے توڑا۔ چھ قبائلی علاقے بھی سنگِ راہ بنے جن کے باشندے وحشی اور خونخوار تھے اور ان ان علاقوں میں سے اس قافلے کا گذر ہوا جہاں کبھی کسی چینی فوج کے قدم نہ پہنچے تھے اور اس پیدل قافلے میں ماؤزے تنگ بھی تھے۔ چو این لائی بھی۔ کمانڈر اِن چیف چوتہ بھی تھے اور لِن پیاؤ بھی ڈاکٹر سن یات سن۔۔۔ چین کے جمہوری انقلاب کے قائد کی زندگی میں ماؤزے تنگ اور چو این لائی بھی اس کے ساتھ تھے اور چیانگ کائی شیک بھی، ۱۹۲۴ء میں سن یات سن کا انتقال ہوا تو دونوں دھڑے الگ ہو گئے۔ ایک وہ جو مزدوروں اور کسانوں کو انقلاب کے ثمرات کا وارث جانتے تھے۔ دوسری طرف وہ جن کے جائدادوں اور

صنعتوں کے مفاد تھے۔ چیانگ کائی شیک نے فوجی طاقت پر قبضہ کر کے سب سے پہلے کینٹن میں ہزاروں انقلابی کارکنوں کو تیغ کے گھاٹ اتارا۔ کینٹن میں ہم نے وہ مقامات دیکھے جہاں یہ خونی ڈراما کھیلا گیا تھا۔ اور شہیدوں کی یادگار پر پھول چڑھائے۔ اس دن ۴ مئی یعنی چین کے یوم بیداری کی سالگرہ بھی تھی۔ ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۹ء میں شنگھائی میں مزدوروں کے خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ فرانس کے دانشور آندرے مالرد کا ناول انسان کی قسمت، شنگھائی کی انہی خونریزیوں کے پس منظر میں ہے۔



دشمن پر اچانک حملہ

انقلابیوں نے خود کو گنے چنے علاقوں میں مرکوز کر لیا۔ ان میں سے سب سے بڑا گڑھ کیانگسی کا صوبہ تھا، جو شنگھائی اور کینٹن کے درمیان پڑتا ہے۔ یہاں چھ سال تک انقلابی حکومت قائم رہی اور چیانگ کائی شیک کی چھاتی پر مونگ دلتی رہی۔ چانگ نے پے در پے چار مہمیں انقلابیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے بھیجیں لیکن یہ جرّار لشکر سلامت لوٹ کے نہ آئے۔ انقلابوں کی جمعیت شروع میں سینکڑوں تک محدود تھی۔ پھر ہزاروں ہوئی، پھر لاکھوں۔ ہتھیار ان کے پاس وہ تھے جو کومن تانگ کی فوجوں سے چھینے جاتے تھے۔ پہلی چار مہموں میں چیانگ کے پورے پورے بریگیڈ اور ڈویژن خاک میں ملا دیے گئے۔ لیکن پانچویں مہم کہ سب سے بڑی مہم تھی، انقلابیوں کے لیے قیامت ثابت ہوئی۔

۱۹۳۳ء کا اوائل تھا کہ چانگ کائی شیک نے اس پانچویں مہم کا طبل جنگ بجایا اور انقلابیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے نو لاکھ کی فوج لے کر چڑھ آیا۔ انقلابی علاقے اور صوبوں میں بھی تھے۔ تنہا کیانگسی پر اس کی چار لاکھ فوج حملہ آور ہوئی جو ۳۶۰ رجمنٹوں پر مشتمل تھی۔ ادھر انقلابیوں کے پاس ریزرو دستے شامل کر کے بھی ایک لاکھ اسّی ہزار کی نفری تھی۔ بے قاعدہ رضاکار، دو لاکھ کے قریب ان کے علاوہ تھے جن کو اس زمانے میں کبھی سرخ محافظ کہتے تھے بلکہ آج کے سُرخ

محافظوں نے یہ نام وہیں سے مُستعار لیا ہے۔ ہتھیاروں کے نام ان کے پاس ایک لاکھ سے کم ہی رائفلیں تھیں۔ بھاری توپ خانہ نام کو نہ تھا۔ بم گولے اور بارود بھی کم ہی تھا۔ ایک ہی تو اسلحہ خانہ تھا وہ بھی چھوٹا سا۔ چوکی جن کے مقام پر اس کی پیداوار اونٹ کے منہ میں زیرہ سمجھنی چاہیے۔ اس کے مقابلے میں چائی کائی شیک کے پاس وسائل کی کمی نہ تھی۔ نئے سے نئے اور بھاری سے بھاری ہتھیار تھے۔ جرمن فوجی مشیر تھے۔ باہر کے ملکوں سے بے پناہ رسد مل رہی تھی۔ لوٹ کھسوٹ سے خزانہ بھرپور تھا۔ مشینی اور بکتر بند دستے تھے۔ طاقت ور ہوائی بیڑا تھا جس میں کوئی چار سو جنگی جہاز تھے۔ اس کے مقابلے میں انقلابوں کے پاس فقط چند جہاز تھے جو انہوں نے چیانگ کی سپاہ سے چھینے تھے اور تین یا چار پائلٹ۔ لیکن پٹرول نہ تھا۔ بم نہ تھے، مکینک نہ تھے۔ پانچویں مہم میں چانگ کائی شیک نے اپنا لڑائی کا نقشہ بھی بدل دیا تھا۔ کہا جاتا ہے یہ نقشہ جرمن جنرل فاکن ہازن کا تیار کردہ تھا اور مقصود یہ تھا کہ انقلابیوں کو گھیرے میں لیا جائے۔ ان کی رسد کے راستے بند کیے جائیں اور محاصرہ تنگ کرتے کرتے ان کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

یہ تدبیر کاری ثابت ہوئی۔ رسد کی قلّت پڑنے لگی۔ نمک تو بالکل نایاب ہو گیا۔ روزمرّہ کی بمباری سے ہزاروں کسان مارے گئے۔ سرخ فوج کے کوئی ساٹھ ہزار

آدمی اس مہم میں مقتول و مجروح ہوئے۔ شہری آبادی کا اور زیادہ نقصان ہوا۔ پورے پورے علاقے آبادیوں سے خالی اور ویران ہو گئے۔ کومن تانگ کے اپنے دعوے کے مطابق اس مہم میں تہ تیغ ہوئے اور فاقے سے مرنے والوں کی تعداد کوئی دس لاکھ ہو گی۔

اس وقت انقلابوں میں بھی دو دھڑے تھے۔ ایک جو برسرِ اقتدار تھا۔ اس سے کئی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں لیکن بہت کچھ نقصان اٹھانے کے بعد۔ ماؤزے تنگ کے ہم خیالوں کی یہ بات مان لی گئی کہ اس وقت ہجرت ہی مناسب ہے۔ اس وقت شمال مغرب کے انقلابی علاقوں کو اپنا ٹھکانہ بنا کر اپنی طاقت مستحکم کرنی چاہیے۔ پھر کومن تانگ سے نپٹا جائے گا۔

منصوبہ بنایا گیا اور اسے چپ چاپ اس پر عمل شروع ہوا کہ کومن تانگ کی فوجوں کو اس وقت سن گن ملی جب کہ نوّے ہزار انقلابی فوج راتوں کے پردے میں مارا مارا کوچ کرتی ہوئی کئی روز کی راہ نکل گئی تھی۔ پہلی تین راتوں میں تو انقلابیوں نے مغرب اور جنوب کی طرف تھوڑے تھوڑے پاؤں پھیلائے لیکن چوتھی رات غیر متوقع طور پر یک بارگی انہوں نے ہنان اور کوانگ تونگ کے صوبوں میں کومن تانگ کی قلعہ بندیوں پر حملہ کیا۔ سرکاری فوجیں بھاگ کھڑی ہوئیں اور جنوب کی

تمام قلعہ بندیوں پر انقلابیوں کا قبضہ ہو گیا۔ یوں جنوب اور مغرب کے راستے ان کے لئے کھل گئے۔

اس منزل تک پہنچنے کے لیے انقلابیوں کو محاصرے کے چار حلقے توڑنے پڑے۔ ایک کے بعد ایک ۱۶ اکتوبر کو کوچ شروع ہوا۔ ۲۱ کو پہلا حلقہ ٹوٹا۔ ۳ نومبر کو دوسرے حلقے کی زنجیریں شکست ہوئی اور ہفتہ بھر بعد تیسرا بھی پامال ہوا۔ چوتھی مورچوں کی لائن ۲۹ نومبر کو سرخ فوج کے دباؤ کی تاب نہ لا کر جواب دے گئی۔ اس تاریخ کے بعد انقلابی فوج ظفر موج سیلاب کی صورت سارے جہان میں پھیل گئی تھی۔ جہاں سے انہیں سیدھے زیچوان جانا تھا جس کی سرحد مغرب میں تبّت سے ملی ہوئی ہے۔ زیچوان سے آگے پھر انقلابی علاقہ شروع ہوتا ہے اور یہی اس قافلے کی منزلِ مقصود تھی۔ کوچ کرنے والی جمیعت میں فقط فوج ہی نہ تھی۔ ہزاروں کسان بھی تھے۔ بچے بھی، بوڑھے بھی، مرد بھی، عورتیں بھی، کمیونسٹ بھی، غیر کمیونسٹ بھی، کیونکہ انقلابیوں نے اپنی چھ سال کی عمل داری میں سارے کیانگسی میں زمینوں کو زمینداروں سے لے کر کسانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ٹیکس گھٹا دیے تھے۔ امدادِ باہمی کے ادارے بنا دیے تھے۔ بے روزگاری، افیم، چکلے بازی، بچوں کی غلامی اور زبردستی کی شادی کا یکسر قلع قمع کر دیا تھا۔ تعلیم عام ہو چکی تھی۔ بعض

علاقوں میں تو خواندگی کا تناسب ۸۰ فی صد ہو گیا تھا۔ کومن تانگ کے دوبارہ قبضے کا مطلب ان اصلاحات کا صفایا تھا اور ان تمام بلاؤں کی واپسی۔

سو نقشہ ان کوچ کرنے والوں کا یہ تھا کہ کسی نے کسی مشین کا پہیہ کاندھے پر رکھ چھوڑا تھا۔ کوئی بہینگی میں خراد کے پرزے اُٹھائے تھا۔ کیونکہ کوچ کرنے سے پہلے اسلحہ خانہ اکھاڑ لیا گیا تھا۔ فیکٹریاں ادھیڑ لی گئی تھیں۔ بھاری مشینیں خچروں اور گدھوں پر بار کی گئیں لیکن زیادہ تر بوجھ لوگوں نے خود اٹھایا۔ راستے دشوار گزار تھے لہٰذا بہت سامان سر راہ پھینکنا ہی پڑا۔ بلکہ ہزاروں رائفلیں اور مشین گنیں، بارود، حتیٰ کہ چاندی کے ذخیرے بھی سرِ راہ دفن کرنے پڑے۔ اب آ کر شاید وہ نکالے گئے ہوں۔ ادھر پیچھے اس کوچ کے باوجود کومن تانگ کو شہروں پر قبضہ کرنے میں ہفتوں لگے کیونکہ ہزاروں شہریوں اور باقی ماندہ سرخ فوجیوں نے ڈٹ کر مقابلے کیئے۔ یہ لوگ جن کی تباہی اور موت یقینی تھی رضاکارانہ طور پر پیچھے رہ گئے تاکہ ان کی قربانی کی بدولت باقیوں کی سلامتی کا راستہ کھلا رہے۔ ان کو بجا طور پر مجاہدوں اور شہیدوں میں گنا جاتا ہے۔ یہ لوگ مقابلے پر نہ ہوتے تو کومن تانگ کی ساری فوج کوچ کو ی چُو کی سرحد تک کی مسافت ان بے سر و سامان مسافروں کے لیے موت کی وادی کے سمان تھی۔ یہ پیدل، دشمن سوار۔ یہ خستہ و خراب، دشمن

تازہ دم اور کیل کانٹے سے لیس یہ کم۔ دشمن لاتعداد۔ دشمن کو ان کا راستہ معلوم تھا۔ وہ پہلے سے پھندے بچھا مورچے جما ان کی تاک میں بیٹھ جاتا تھا۔ کوی چُوتک پہنچتے پہنچتے کوچ کرنے والوں میں سے ایک تہائی ختم ہو چکے تھے۔



گھات میں لگے ہوئے کرنے والے قافلے پر جاگرتیں اور پھر نہ جانے کیا ہوتا؟

اب طے ہوا کہ یہ تو تباہی کا راستہ ہے۔ تیر کی طرح سیدھے جانے کی بجائے راہوں کو الجھاتے ہوئے چلو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی قافلے کو بیچ میں رکھ کر چار دستے یمین و

یسار جھڑپوں میں مشغول ہو جاتے اور مرکزی قافلہ آگے بڑھتا رہا۔ کومن تانگ کے ہوائی جہاز بھی اس لہریا دار خروج کے آگے زچ ہو جاتے۔ اب چیانگ کائی شیک نے یہ تاڑ لیا کہ یہ لوگ دریائے یانگسی کو پار کر کے زیچوان میں داخل ہوں گے۔ ہزاروں سپاہ بھیج کر دریا کے ناکے اور پہاڑ کے درّے مسدود کر دیے۔ تمام کشتیاں جنوبی کنارے سے شمالی کنارے منتقل کر دی گئیں۔ فصلیں اُجاڑ دی گئیں۔ کوی چُو میں ایک لاکھ کومن تانگ سپاہ انقلابیوں کے خیر مقدم کو کھڑی تھی۔

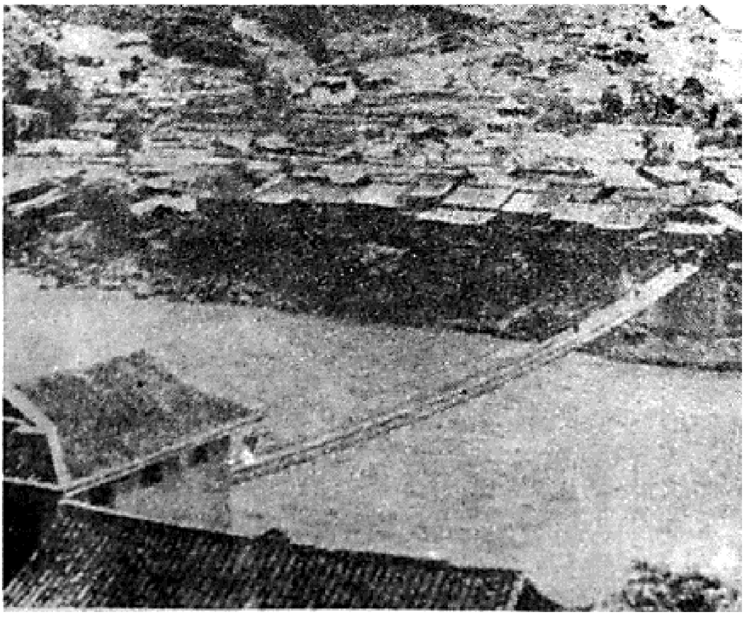
چیانگ چاہتا تھا کہ انقلابیوں پر یانگسی کی راہ بند کر کے ان کو جنوب مغرب میں تبّت کے ویرانوں کی طرف دھکیل دے اور وہاں ان کو ختم کر دے لیکن اپریل ۱۹۳۵ء میں اس کی توقع کے برعکس سُرخ فوجوں نے یک لخت رُخ بدلا اور جنوب میں نیان کے صوبے میں ہو کر برما اور ویتنام کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ چار دن میں یہ فوجیں نیان کے دارالحکومت ینانفو کے دس میل کے اندر پہنچ گئیں۔ مادام چیانگ کائی شیک جو ان دنوں وہاں تھیں ریل سے فرانسیسی ہند چینی کی طرف بھاگیں۔ چیانگ نے انقلابیوں کے پیچھے اپنی فوج جرّار ڈال دی لیکن یہ تو محض ایک چال تھی۔ ینانفو کی طرف تو فقط تھوڑی سی فوج گئی تھی بڑا حصّہ تو مغرب کو مُڑ گیا تھا کہ لینگ کائی کے مقام پر دریا عبور کرے۔

یہ لینگ کائی ہے۔۔۔۔ یانگسی کے دونوں طرف فلک بوس پہاڑ عموداً کھڑے ہیں۔ درّوں میں کومن تانگ کے مورچے ہیں۔ دریا کی کشتیاں شمالی کنارے لے جا کر جلا دی گئی ہیں۔ سرخ فوج کے تین دستے وہاں پہنچتے ہیں۔ کشتیاں جلی دیکھ کر بانس کا پل بنانا شروع کر دیا ہے۔ لیکن پُل تو کئی ہفتے میں بنتا ہے۔ چیانگ نے نعرہ لگایا "وہ مارا۔ اب یہ لوگ زندہ بچ کر نہیں جا سکے۔"

لیکن یہ دوسری چال تھی۔ سُرخ فوج کی ایک بٹالین نے یک لخت رُخ موڑ کر چو پنگ کے قلعے کی راہ پکڑی۔ کشتیوں سے دریا پار کرنے کا یہی ایک ناکہ رہ گیا تھا۔ اس بٹالین نے ۸۵ میل کی راہ ایک دن رات میں طے کی اور سرکاری فوجوں سے چھینی ہوئی وردیوں میں ملبوس سرشام چو پنگ کے قصبے میں جا اترے اور غنیم کے ہتھیار رکھوا لیے۔

کون گمان کر سکتا تھا کہ انقلابی جو تین دن کی راہ پر تھے۔ راتوں رات آ موجود ہوں گے۔ لہٰذا کشتیاں شمالی کنارے پہنچا تو دی گئی تھیں لیکن جلائی نہ گئی تھیں۔ اندھیرے میں یہ سرخ فوجی بستی کے کچھ افسروں کو دریا کے کنارے لے گئے اور دریا پار کے محافظوں کو پیغام بھجوایا کہ ایک کشتی اِدھر بھیجو۔ سرکاری فوج کے کچھ لوگ اِدھر آنا چاہتے ہیں۔ ایک دستہ ان میں سوار ہو کر دریا پار پہنچا۔ اس وقت

کومن تانگ فوجی رائفلیں ایک طرف لٹکائے تاش کھیل رہے تھے۔ وہ ہکّا بکّا رہ گئے۔ اب باقی ماندہ انقلابی سپاہ بھی پہنچ گئی۔ چھ کشتیاں نو دن تک متواتر پھیرے کرتی رہیں اور کشتیاں جلا کر مزے سے اس پار پڑاؤ ڈالا۔ چیانگ کائی شک دانت پیس کر رہ گیا۔ ہوائی جہاز میں زیچوان پہنچا تو بولا یانگسی کی خیر ہے۔ اب دکھوں یہ لوگ دریائے تاتو کیسے پار کرتے ہیں۔ ان کی قبریں اس پار نہ بنیں تو چیانگ نام نہیں۔



لانگ مارچ کی کہانی (۲)

دریائے تاتو کا پار کرنا لانگ مارچ کی سب سے خطرناک اور سب سے حیرت ناک مہم گنی جاتی ہے۔ دریائے یانگسی کے عبور سے کہیں زیادہ۔ یہاں سرخ فوج کے قدم رُک جاتے تو وہ نیست و نابود ہو جاتی۔ تاریخ میں اس سے پہلے کتنی ہی فوجیں دریائے تاتو کے کنارے تباہ ہو چکی تھیں۔ انیسویں صدی میں تائے پنگ کی بغاوت مشہور ہے۔ مانچوؤں کی شاہی فوجوں نے ایک لاکھ تائے پنگ فوج کو یہیں روکا اور ختم کر دیا اور اب چیانگ کائی شیک نے سوچا کہ انقلابیوں کا حشر یہی ہونا ہے۔ یہ دریا ان کے خون سے رنگین ہو گا لیکن تائے پنگ فوج کی کمان کرنے والے شہزادہ شہ نے یہ غلطی کی تھی کہ تین دن کو وہاں رُک گیا تھا اپنے بیٹے کی سالگرہ منانے کے

لیے ان تین دن میں شاہی فوج نے اسے گھیر کر راہِ فرار مسدود کر دی۔ انقلابیوں کو یہ غلطی دہرانا منظور نہ تھا۔

لہٰذا یانگسی سے شمال رویہ زیچوان میں داخل ہو کر جلد ہی وہ آزاد لولو لینڈ کے علاقے میں داخل ہو گئے جہاں سفید اور سیاہ جنگجو لولو قبائل آباد ہیں۔ یہ قبیلے کبھی چین کے مطیع نہیں رہے اور چینیوں سے ان کو ازلی دشمنی ہے۔ سرخ فوجی اس سے پہلے دوسرے صوبوں کے قبائل کے درمیان سے بخیر و خوبی گزر چکے تھے اور ان قبائل کے کچھ آدمی ان کی فوجوں میں شامل ہو چکے تھے۔ اب ان کو ایلچی بنا کہ لولو سرداروں کے پاس بھیجا گیا۔ رستے میں سرخ فوجوں نے بہت سے قبائلی سرداروں کو کومن تانگ افسروں کی قید سے چھڑایا۔ اتفاق سے سُرخ فوج کے ہراول دستے کا کمانڈر ان نواح میں رہ چکا تھا اور ان کی زبان بھی کچھ کچھ بول لیتا تھا۔ وہ جا کر لولو سرداروں سے ملا۔ انہیں بتایا کہ وہ چینی جن سے تم نفرت کرتے ہو اور ہیں۔۔۔ ہم اور ہیں۔ ہمیں تمہاری آزادی کا احترام ہے۔ کومن تانگ کے دشمن تم بھی ہو، ہم بھی ہیں۔ ان لولو سرداروں نے آزمانے کے لیے کہا کہ اچھا یہ بات ہے تو ہمیں اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار دو۔ سرخ فوج نے یہ بات فوراً مان لی۔ اس پر لولو حیران رہ گئے۔ نہ صرف یہ راستہ سلامتی سے طے ہوا بلکہ سینکڑوں لولو بھی سُرخ فوج میں

شریک ہو گئے۔

لولو لینڈ کے جنگلوں سے نکل کر جہاں درختوں اور سبزے کی وجہ سے کومن تانگ کے ہوائی جہاز بھی ان کو نہ دیکھ سکے، یک لخت ان لوگوں نے دریا کی ساحلی چوکی این جن چانگ پر دھاوا بول دیا۔ یہاں پھر قسمت نے ان کی یاوری کی۔ پہاڑی پر چڑھ کر دریائے تاتو کی پنہائی پر نظر ڈالی تو کیا دیکھتے ہیں کہ تین کشتیاں جنوبی کنارے کے ساتھ لنگر انداز ہیں۔

یہ کیسے ہوا؟ ہوا یہ کہ اس وقت کومن تانگ کی صرف ایک رجمنٹ دوسرے کنائے پر تعینات تھی لیکن اس کا کمانڈر اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سرخ فوجیں لولو لینڈ کے راستے کبھی اتنی جلدی یہاں نہ پہنچ سکیں گی۔ انہیں کئی دن لگیں گے لہٰذا اس روز وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے اور دعوت اڑانے شہر آیا ہوا تھا۔ سرخ فوج نے کمانڈر کو بھی پکڑا، کشتیاں بھی قبضے میں لیں۔ اب بس دریا پار کرنا تھا۔

ہر کمپنی میں سے سولہ سولہ آدمیوں نے پہلی کشتی میں دریا پار کرنے اور دوسری کشتیاں ادھر لانے کی پیش کش کی۔ جنوبی کنارے پر سرخ فوج نے مشینیں گنیں

نصب کیں اور چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ سیلاب کے پانی نے تاتو کا پاٹ یانگسی سے بھی بڑھا دیا تھا۔ کشتی کو اس پار پہنچنے میں دو گھنٹے لگے۔ ادھر بستی کے لوگ سانس روکے کھڑے دیکھ رہے تھے کہ اب کیا ہوتا ہے۔ اب ان کا صفایا ہوا کہ ہوا۔ لیکن جنوبی کنارے سے سرخ فوجوں نے مشین گن کی ایک حفاظتی باڑھ ماری۔ پار اترنے والوں کی چھوٹی سی ہلڑی پیچ کھا کر دشمن کی فوجوں کے پیچھے ایک پہاڑی پر جا اتری اور وہاں کی ہلکی مشین گنوں سے فائر کیے اور کچھ بم بھی اچھال دیئے۔

دیکھتے دیکھتے کومن تانگ فوجی پسپا ہوئے اور پھر پسپا ہوتے چلے گئے۔ ہاؤ کی آوازیں گونجیں۔ کشتیوں کے گھاٹ پر اب سرخ فوجوں کا قبضہ تھا۔ اب پہلی کشتی واپس آئی اور اپنے ساتھ دو کو اور کھینچ لائی اور دوسرے ہلّے میں ہر ایک میں اسّی اسّی جوان سوار تھے۔ اس دن اس رات اور پھر کئی دنوں تک کشتیاں مصروف رہیں، حتیٰ کہ ایک ڈویژن فوج اس پار پہنچ گئی۔ لیکن دریا کا دھارا روز بروز تیز ہو رہا تھا۔ تیسرے روز تو کشتی کو اس پار جانے میں چار گھنٹے لگے جس کا مطلب یہ تھا کہ تمام فوج اور ساز وسامان اور بار بردار جانوروں کو ادھر پہنچانے میں ہفتوں لگ جائیں گے اور اتنے میں غنیم گھیر اڈالنے کو آموجود ہو گا۔ اب لن پیاؤ کی فوج این جن چانگ میں جمع تھی۔

چیانگ کائی شیک کے ہوائی جہاز نہ صرف دیکھ چکے تھے۔ بلکہ اس پر بمباری بھی کر چکے تھے۔ دشمن کی فوجیں ہر طرف سے کمک کو بڑھی آ رہی تھیں۔ لن پیاؤ چوتہ، ماؤزے تنگ، چو این لائی اور پنگ تہ ہوائی نے فوراً آپس میں مشاورت کی اور ایک فیصلہ کیا اور فی الفور اس پر عمل شروع کر دیا۔

اس جگہ سے کوئی ڈیڑھ سو میل دور مغرب میں جہاں اونچی گھاٹیوں کے درمیان دریا گہرا اور پاٹ میں کم چوڑا ہو جاتا ہے اور لوہے کی زنجیروں کا ایک مشہور پل ہے جسے لیو کا پل کہتے ہیں۔تبّت کے مشرق میں تاتو دریا پار کرنے کا یہ آخری پل ہے۔ اب یہ فوج پیادہ پا اس طرف روانہ ہوئی۔ کبھی یہ ہزاروں فٹ اونچی چٹانوں پر ہوتے، کبھی ان کی پگڈنڈی نیچے ترائی میں سے گزرتی جہاں کمر کمر تک کیچڑ اور دلدل تھی۔ اگر وہ اس پل کو پار کر لیتے ہیں تو پوری فرج مرکزی زیچوان میں اترتی ہے۔ لیکن اگر نہیں کر سکتے تو۔۔۔؟ تو انہیں الٹے پاؤں لولو لینڈ میں سے گزر کر دوبارہ صوبہ نیان میں داخل ہونا پڑے گا اور پھر لڑتے بھڑتے تبّت کی سرحد پر لی کیانگ پہنچنا ہو گا۔۔۔ یہ کوئی ڈھائی سو میل کی مسافت ہے اور جب تک کتنوں کی جان سلامت رہے گی؟

اب ادھر سے تاتو کے جنوب کی سرخ فوجوں نے ادھر بڑھنا شروع کیا، اُدھر شمال کی فوجوں نے۔ کسی بار پاٹ تنگ ہو جاتا تو یہ دونوں ایک دوسرے کو آواز دے سکتے

تھے دن رات یہ قافلے تیزی سے بڑھتے گئے بس دس منٹ کو آرام یا کھانا کھانے کو رکتے تھے۔

دوسرے دن دریا کے داہنے ہاتھ والا دستہ پیچھے رہ گیا۔ اس لیے کہ زیچوان کی سرکاری فوجوں سے جھڑپیں ہونے لگیں۔ جنوبی دستہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ یکایک انہوں نے دیکھا کہ دوسری طرف کومن تانگ کی فوجیں بھی لیو کے پل کی طرف یلغار کرتی جارہی ہیں۔ اب دونوں میں دوڑ شروع ہوئی لیکن سرخ فوج کے ہراول دستے اپنے انقلابی عزم کی بدولت بازی لے گئے۔

یہ پل صدیوں پرانا تھا۔ سولہ بھاری آہنی زنجیریں آرپار تنی تھیں۔ یہاں پاٹ کو سو گز تھا۔ زنجیروں کے سرے بھاری چٹانوں میں پیوست تھے۔ ان زنجیروں کے درمیان لکڑی کے تختے اور شہتیر سڑک کا کام دیتے تھے لیکن جب سرخ فوج وہاں پہنچی تو دیکھا کہ ان میں سے آدھے تختے ہٹائے جاچکے ہیں۔ صرف زنجیریں باقی ہیں۔ شمال کنارے دشمن کا ایک دستہ مشین گنیں سنبھالے بیٹھا تھا۔ اور ان کے پیچھے کومن تانگ فوج کی ایک رجمنٹ انتظار کر رہی تھی۔ زیچوان کے لوگوں کو اس پل سے جذباتی دلبستگی نہ ہوتی تو اسے بھی تباہ کیا جاسکتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس پل کی تعمیر پر اٹھارہ صوبوں کی دولت صرف ہوئی تھی۔ پھر یہ کون سوچ سکتا تھا کہ

سرخ فوجی فقط زنجیروں پر چلتے ہوئے دریا عبور کرنے کی کوشش کریں گے لیکن انہوں نے کیا یہی۔ مقصود یہ تھا کہ دشمن کی کمک پہنچنے سے پہلے پل کے ناکے پر قبضہ کیا جائے۔ اس خطرناک آزمائش کے لیے پھر لوگ رضاکارانہ آگے آئے۔ ان میں سے تیس جوان چُنے گئے۔ ان کے پاس بم تھے اور انہوں نے زنجیروں کے حلقوں پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا۔ سرخ فوجوں کی مشین گنوں نے سہارے کے لیے دشمن کے ناکے پر گولیاں برسانی شروع کیں۔ ادھر سے بھی جواب آیا اور اب گولیاں پُل عبور کرنے والے مجاہدوں کا بھی نشانہ لینے لگیں۔ سب سے آگے کا مجاہد گرا، پھر دوسرا پر تیسرا۔ لیکن اور آگے بڑھنے پر تختوں کی اوٹ انہیں ملی اور وہ گولیوں سے محفوظ ہوئے۔ آخر ایک مجاہد لکڑی کے تختے پر جا کر کھڑا ہوا اور ایک دستی بم دشمن کے دستے پر دے مارا۔ کھلبلی مچ گئی۔ شور ہو کہ باقی تختے بھی توڑ دو، یا اٹھادو، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو رینگتے رینگتے اور لوگ بھی پہنچ گئے تھے۔ تختوں پر پیرافین چھینک کر آگ لگا دی گئی لیکن جب تک بیس سرخ جوان ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل بڑھتے بہت قریب آچکے تھے اور دشمن کے مشین گنوں کے ٹھکانوں پر بم پھینک رہے تھے۔ یکایک جنوبی کنارے پر نعرہ گونجا۔ ”سرخ فوج زندہ باد۔“ ”انقلاب زندہ باد۔“ ”تاتو پُل کے تیس ہیرو زندہ باد۔“ دشمن بھاگ

کھڑا تھا۔ شعلوں کے سایوں میں مجاہد دشمن کی چوکی پر قابض ہو چکے تھے۔

اب اور بھی لوگ زنجیروں پر چڑھ کر آ گئے اور آگ بجھانے اور تختے دوبارہ جمانے لگے۔ ادھر شمالی کنارے کی سرخ فوج کے دستے بھی آ پہنچے۔ چیانگ کائی شیک کے طیارے فضا میں گرجتے رہ گئے۔ انہوں نے پل کو بھی بم گرا کر اڑانے کی کوشش کی لیکن وہ سارے بم پانی میں گرے۔

اس روز دریائے تاتو کے اس پار جو جشن برپا ہوا اس کا اندازہ خود ہی کر لیجیے۔ لیکن ابھی کڑے کوسوں کی منزلیں باقی تھیں۔ ابھی تو دو ہزار میل کا پیادہ پا سفر درپیش تھا۔

تاتو دریا کے شمال میں انہیں سولہ ہزار فٹ اونچے پہاڑوں پر چڑھنا پڑا جہاں سے مغرب کی طرف تبّت کی دھرتی بس برف کا مندر نظر آتی تھی۔ یہاں کچھ لوگ پہاڑوں کی سردی کی تاب نہ لا کر مرے، کچھ دلدلوں کی نذر ہوئے۔ ایک آرمی کور کے تو دو تہائی جانور جو بار برداری کا واحد ذریعہ تھے دلدل میں ایسے ڈوبے کہ پھر نہ ابھر سکے۔

لیکن یہ نقصان بھی ان کا راستہ نہ روک سکا۔ پہاڑیوں اور گھاٹیوں پر یہ جرّی سپاہ

آگے بڑھتی ہی گئی۔ آخر ۲۰ جولائی کو انہوں نے ماؤ کنگ کے زرخیز خطے میں ڈیرے جاڈالے۔ یہ بھی ایک انقلابی علاقہ تھا لیکن ان لوگوں کو تو اور آگے جانا تھا۔

نو ماہ پہلے یانگسی کے پڑاؤ سے جو پہلی، تیسری، پانچویں، آٹھویں اور نویں فوجیں چلی تھیں ان میں اب فقط ۴۵ ہزار آدمی رہ گئے تھے۔ باقی تمام ہلاک اور تباہ نہ ہوئے تھے بلکہ کچھ دستے ہر علاقے میں پیچھے چھوڑ دیے جاتے تھے کہ کسانوں کو منظم کریں اور دشمن کو نقصان پہنچائیں۔ ہزاروں رائفلیں سر راہ اسی لیے لوگوں میں بانٹ دی گئی تھیں۔

راستے میں اس سپاہ نے بہت سے دوست بنائے تھے۔ بہت سے دشمن۔ دشمن وہ جاگیر دار اور سرمایہ دار جن سے انہوں نے رسد حاصل کی اور دوست وہ غریب جن کو انہوں نے مدد دی۔ فوج کی ضروریات سے فاضل تمام رسد لوگوں میں بانٹ دی جاتی تھی۔ جائدادوں کے قبالے قتل کر دیے گئے۔ ٹیکس اڑا دیے گئے اور غریب کسانوں کو مسلح کر دیا گیا۔ کیانگسی سے چلتے ہوئے یہ فوج اپنے ساتھ کافی خزانہ لیے ہوئے تھی۔ جب کبھی کسانوں سے کچھ لیا جاتا اس کا معاوضہ بھی دیا جاتا تھا۔ وہ تو یہ جانتے تھے کہ یہ غریب آدمیوں کی فوج ہے۔

یہاں تین ہفتے آرام کرنے کے بعد انقلابیوں کی مجموعی سپاہ جو ایک لاکھ تھی، روانگی سے پہلے دو حصّوں میں بٹ گئی۔ ایک نے شمال مغرب کا رُخ کیا، دوسرا زیچوان میں رہ گیا۔ اس وقت کچھ انقلابی اس خیال کے بھی حامی تھے کہ یہیں خود کو اور مستحکم کر کے یانگسی کے جنوب کے علاقے پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن ماؤزے تنگ اور ان کے ہم خیال شمال مغرب کی طرف خروج کے حامی تھے۔

آخر اگست میں قافلہ سوئے شمال مغرب روانہ ہوا لیکن کچھ فوج چوتہ کی کمان میں زیچوان ہی میں چھوڑ دی گئی۔ خروج کرنے والی سپاہ کی کمان ماؤزے تنگ، ہن پیاؤ، چو این لائی اور دوسرے کمانڈر کر رہے تھے۔ یہ سپاہ تیس ہزار پر مشتمل تھی۔

اب اس سفر کا سب سے خطرناک علاقہ شروع ہوتا ہے۔ مانزو قبائل کی سرزمین اور مشرقی تبّت کے خونخوار خانہ بدوشوں سی فان کی قلمرو۔ یہاں انقلابی فوج کو زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے پاس روپیہ تھا لیکن اس سے خوراک خرید نہ سکتے تھے۔ بندوقیں تھیں لیکن کس پر چلاتے۔ دشمن سامنے نہ آتا تھا۔ گھات میں لگا رہتا تھا۔ جدھر یہ فوج جاتی لوگ بستیاں اُجاڑ جاتے۔ ساری کھانے پینے کی چیزیں سمیٹ لے جاتے۔ مرغیاں، بطخیں، اور مویشی ہر چیز ہانک لے جاتے۔ اگر کوئی فوجی کسی بھیڑ کو پکڑنے کے لیے راستے سے اِدھر اُدھر ہوتا تو زندہ و

سلامت نہ واپس آتا۔ جہاں کوئی ایسا درّہ آتا جس میں سے دو چار سے زیادہ کے گزرنے کی گنجائش نہ ہوتی تو یہ لوگ اوپر سے چٹانیں لڑھکا دیتے۔ یہاں اس کا موقع ہی نہ تھا کہ کوئی ان پر واضع کرتا کہ وہ اور چینی ہیں جن سے تم ڈرتے ہو۔ یہ اور ہیں۔ قبیلے کی ملکہ نے حکم دیا تھا کہ جو شخص ان لوگوں کی مدد کرے گا اسے دیگ میں ڈال کر ابال دیا جائے گا۔ ناچار یہاں ان لوگوں کو مجبوراً طاقت استعمال کرنی پڑی۔ یہاں کے شلجم ایسے بڑے بڑے تھے کہ ایک شلجم سے پندرہ آدمی پیٹ بھر لیں۔

اس کے بعد گھاس اور دلدلوں کی سرزمین شروع ہوئی۔ یہاں دور تک کوئی بستی دکھائی نہ دیتی تھی۔ بارش یہاں مسلسل تھی اور دلدلوں میں سے گذرنے کا تنگ راستہ فقط مقامی باشندوں کو معلوم تھا۔ یہاں بہت آدمی اور بہت مویشی دلدل کی نذر ہوئے۔ جہاں کسی کا پاؤں رپٹا وہ اندر ہی اندر دھنستا چلا گیا۔ یہاں جلانے کو لکڑی تک نہ تھی۔ کچی سبزی اور کھانا کھانا پڑتا تھا۔ پناہ کے لیے اونچے درخت بھی نہ تھے اور ان لوگوں کے پاس خیمے نہ تھے۔ رات کو بس جھاڑیوں کے اوپری سرے باندھ کر یہ لوگ ان کی اوٹ، اور پناہ میں بیٹھتے اور یوں اس امتحان سے بھی فاتحانہ گزر کر یہ قافلے والے کانسو کے صوبہ کی سرحد پر جا اترے۔

دشمن کی فوجوں نے یہاں بھی راستہ روکا۔ یہاں بھی لڑائیاں لڑی گئیں جن میں سے ایک میں ہارنا بھی مکمل شکست ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن انقلابی تمام گھیرے توڑتے گئے اور جب وہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو پورے ایک سال بعد دیوارِ چین کے دامن میں شمالی شینسی جا کر اترے تو گننے پر معلوم ہوا کہ فقط بیس ہزار ہیں۔ ان میں سے اکثر کے پاؤں راہ کی صعوبتوں سے سوجے ہوئے اور پتھر بنے ہوئے تھے لیکن دلوں میں عزم وہمّت کی جوت جل رہی تھی۔ یہ لانگ مارچ جو ایک شکست سے شروع ہوا تھا آنے والی بڑی اور مستقل فتح کا پیغام ثابت ہوا۔ یہاں نیان کے غاروں میں ماؤزے تنگ نے اپنی طاقت کو مستحکم کیا۔ جاپانیوں کو ناکوں چنے چبوائے اور آخر میں سارے چین نے ان کی فاتحانہ یلغار کے قدم چومے۔

یہاں یہ داستان ختم ہوتی ہے۔

ہمیں اپنے سفر نامے کے درمیان اس حکایتِ طویل ولذیذ کو اس لیے لانا پڑا کہ اس کے بغیر چین کے موجودہ حکمران انقلابیوں کی سخت کوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ نئے چین کی پرانی نسل ہو یا نئی۔ اس مہم اور اس کے سانحات کی چھاپ سبھی کے ذہنوں پر ملے گی۔ اس واقعہ کے متعلق گیت بھی ہیں، ڈرامے بھی، فلمیں بھی، ناول اور کہانیاں بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ماؤزے تنگ اس مہیب مہم میں سے گزر کر ہی

ماؤزے تنگ بنا۔ عوام کے دلوں کا حکمران جس کا کوئی حریف نہیں۔



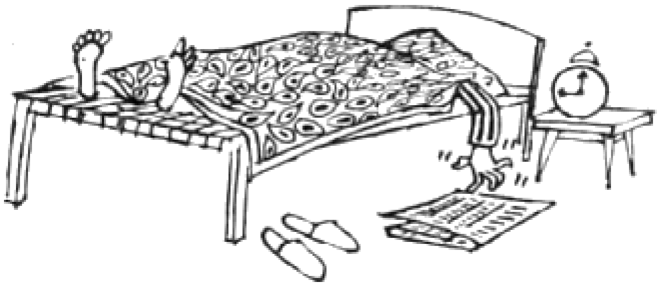
ماؤزے تنگ لانگ مارچ کے وقت

اخبار تو ہوتے ہیں، لیکن خبریں نہیں

اخبار ہماری زندگی کالازمہ بن گیاہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اخبار نہ ہوتے تو ہم صبح صبح کیسے اُٹھتے اور کیوں اُٹھتے ؟ ذاتی طور یہ ہمارے علی الصبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے اُٹھ بیٹھنے کی بھی وجہ اخبار ہے۔ سنتے ہیں دیہات میں لوگ پرندوں کی ہو حق سے بیدار ہوتے ہیں لیکن اس شہر میں درخت کہاں کہ ان پر پرندے بسیرا کریں۔ ان کی جگہ ہمارے ہاں سبزی والوں کی ہانکیں اور ڈبل روٹی مکھن والوں کی پکاریں ہیں۔ خیر مقصد دونوں کالوگوں کی نیند میں خلل انداز ہونا ہے۔ اس وقت کو ہم اپنی زبان میں سے صبحِ کاذب گردانتے ہیں۔ صبح صادق کا تعلق اخبار ہی سے ہے۔ جب ہم بستر پر پڑے پڑے چادر منہ سے ہٹائے بغیر کھٹولے کے نیچے ہاتھ لے جاکر ٹٹولتے ہیں اور

اخبار کا ورق ہاتھ میں آتا ہے تو سمجھ لیتے ہیں کہ آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا۔ طوعاً و کرہاً ہی سہی لیکن اب اٹھنا چاہیے۔ بے شک ہم ایسے لوگوں کو بھی جانتے ہیں جنہوں نے سچ مچ کا سورج طلوع ہوتے دیکھا ہے لیکن جس کے پاس اخبار ہو، اسے سورج کی کیا پروا۔ اخبار لیا لوٹا اٹھایا اور پہنچ گئے خلا میں مدار پر۔

ہم جو چین گئے تو سب سے پہلا مسئلہ یہی پیدا ہوا۔ چین میں اخبار ہوتے تو ہیں لیکن چینی زبان میں۔ اور وہ بھی شام کو نکلتے۔ صبح کو نکلتے تو کم از کم ان کی تصویریں دیکھنے سے لیے باتھ روم جایا جا سکتا تھا۔ نتیجہ اخبار نہ دیکھنے کا یہ ہوا کہ ہمارے ادیبوں کے وفد کے اکثر رکن قبض کا شکار ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے بہت دوائیں کیں لیکن بے فائدہ۔ آخر ہم نے کہا صاحب پی آئی اے والوں سے کہہ کر ان کے لیے اخبار منگوانا شروع کیجئے۔ یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔ یہ تو ہمارے میزبانوں کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ ہوائی جہاز ہفتے میں فقط دو دن شنگھائی جاتا ہے۔ وہاں چینی نیوز ایجنسی کا بلیٹن انہوں نے بھیجنا شروع کر دیا۔ اس سے صورتِ حال کی پوری طرح اصلاح تو نہ ہوئی لیکن بعضوں کا ہاضمہ پہلے سے بہتر ہو گیا۔



پیکنگ سے جو ہم وہاں روانہ ہوئے تو خبروں کے اس بلیٹن سے بھی مفارقت ہو گئی۔ آخر ہم نے اپنے ترجمان سے کہا کہ بھیّا تم ہمیں اخبار پڑھ کر سنایا کرو کیونکہ جن دنوں ہم روانہ ہوئے ہیں، افریقہ کے ملکوں میں ایک انقلاب روزانہ کی اوسط تھی بلکہ ایک روز تو دو دن کے عرصے میں تین انقلاب آئے تھے۔ انہوں نے کہا ایسا کوئی سانحہ اس دوران میں نہیں ہوا ہے۔ ہم نے کہا اچھا پہلی سرخی پڑھو۔ معلوم ہوا وزیرِ اعظم چو این لائی نے سامراجیوں کو خبردار کیا ہے۔ ہم نے کہا آگے بڑھو۔ پتہ چلا آگے البانیہ کے صدرِ مملکت کا پیغام ہے۔ ہم نے کہا اور کوئی خبر ہے۔ بولے ہاں آپ لوگوں کے وہاں پہنچنے کی خبر ہے۔ ہم نے جھنجھلا کر کہا۔ وہ تو ہمیں بھی معلوم ہے۔ خبر وہ ہوتی ہے جو ہمیں معلوم نہ ہو۔ کہیں چوری ڈکیتی، اغوا، آتش زنی کی خبر ہو تو سناؤ۔ اور نہیں تو کوئی ٹریفک کا حادثہ تو ہوا ہو گا۔ ترجمان نے سر ہلا کر کہا کہ اس

قسم کی کوئی واردات آج کل یہاں نہیں ہوتی۔ ٹریفک کا حال آپ نے خود دیکھ لیا۔ کاریں خال خال ہیں اور وہ ڈرائیور لوگ احتیاط سے چلاتے ہیں کیونکہ شام کو انہیں اپنے سیٹھ کو کوئی بندھی ٹکی کی رقم نہیں دینی پڑتی اور بالفرض ایسا کوئی حادثہ ہو بھی جائے تو وہ خبر تھوڑا ہی ہوتی ہے؟ اس کا اخبار سے کیا تعلق؟

ہم نے کہا سخن شناس نئی حافظا خطا اینجاست۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ دوسرے ملکوں میں خبر کسے کہتے ہیں؟ یہاں تو اگر کہیں واردات ہو جائے تو ایک فرلانگ دور جس دودھ والے کی دکان ہے اس کی، اس کے بچوں، اس کے دور کے رشتہ داروں کی تصویریں اور سوانح چھاپتے ہیں۔ باقی رہے سیاسی واقعات اور لیڈروں کی تقریریں، جن لوگوں کے پاس فالتو وقت ہوتا ہے وہ ان پر بھی ایک غلط انداز نظر ڈال لیتے ہیں۔ ورنہ حادثوں کی خبریں اور تصویریں دیکھیں، آج کے فلمی اشتہارات پر نظر ڈالی۔ تاجر نے بونس واؤچر کا بھاؤ دیکھا اور اسکول کے لڑکے نے کھیلوں کا صفحہ نکال لیا۔ کوئی بڑے میاں ہوئے تو جائدادوں اور ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات بھی سہی، باقی بس۔

ختم شد